ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
مارچ ۲۰۱۰ء

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول: ڈاکٹر اسرار احمد

خصوصی مضمون

اسلامی نظام کی نظریاتی اساس:

ایمان

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے

سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہج انقلابِ نبویؐ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر

مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل

اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک

اسلامی انقلاب کے مراحل، مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** حفظہ اللہ

کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

صفحات: 375 قیمت اشاعت خاص: 300 روپے اشاعت عام: 200 روپے

"منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

صفحات: 64 قیمت اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 20 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 3-5869501

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِىْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد : 59

شمارہ : 3

ربیع الاول 1431ھ

مارچ 2010ء

فی شمارہ 20/-

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مجلس ادارت

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

- اندرون ملک 200 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36271241

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

✿ **عرضِ احوال** 3

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

ایوب بیگ مرزا

✿ **بیان القرآن** 5

سورۃ النساء (آیات ۱۱۶ تا ۱۴۱)

ڈاکٹر اسرار احمد

✿ **اسلام کا نظامِ حیات** 28

اسلامی نظام کی نظریاتی اساس: **ایمان**

ڈاکٹر اسرار احمد

✿ **منتخب نصاب۔۲** 59

اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی
جماعت کی ہیئت ترکیبی اور تنظیمی اساس

انجینئر نوید احمد

✿ **تعمیر سیرت** 83

نماز اور ترکِ منکرات

محمد مشتاق ربانی

✿ **کردار کے غازی** 89

اساطینِ علم کے اربابِ اقتدار سے تعلقات (۲)

طاہر اسلام عسکری

❀ ❀ ❀

3

عرضِ احوال

بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر!

اللہ ربّ العزّت کی تخلیق کا ذروۂ سنام کون ہے؟ حسنِ خُلق کی انتہا کون ہے؟ بندگی کی معراج پر کون ہے؟ کائنات میں بے مثل کون ہے؟ حکمت اور دانائی کے بلند ترین مقام پر کون فائز تھا؟ کس کی رسائی وہاں تک ہوئی جہاں پہ فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں؟ آدم وحوا کی اولاد میں سے وہ واحد ہستی کون سی ہے جس کا اٹھنا بیٹھنا' چلنا پھرنا' کھانا پینا' سونا جاگنا' دیکھنا سننا' رہنا سہنا اور پہننا اتارنا تاریخ نے مقدس امانت کے طور پر محفوظ کر لیا؟ وہ کون ہے جس کی تجارت دیانت کی علامت تھی؟ وہ کون سی ہستی تھی جس کی امانت داری کی قسم اُس کی جان کے دشمن بھی کھاتے تھے؟ غریب کی پشت پناہی' یتیم کی سرپرستی' بچوں سے شفقت' بڑوں کی عزت و احترام' بیمار کی تیمارداری میں کون انسانوں میں سرفہرست ہے؟ عورتوں کے حقوق اور غلاموں سے اچھے سلوک کا دنیا میں مبلغِ اعظم کون ہے؟ عہد نبھانا' وعدہ وفا کرنا دنیا کو کس نے سکھایا؟ وہ کون سی ہستی ہے جس کی زبان پر صرف حق جاری ہوتا اور جس سے صرف عدل کا صدور ہوتا؟ کسے جدید دور کے محققین نے تاریخ کا دھارا موڑ دینے والوں میں سے سرفہرست قرار دیا' یعنی عظیم ترین انقلابی تسلیم کیا؟ ایک مسلمان کے لیے اِس پرچۂ سوالات کا جواب دینا آسان ترین کام ہے' جس کے لیے ایک لمحہ بھی سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ یقیناً یہ وہی ہستی ہے جس پر کائنات کے خالق و مالک نے خود درود و سلام بھیجا!—— لیکن مقامِ افسوس ہے کہ محبت کے تقریری اور تحریری دعووں کے باوجود اِس مقدس ترین ہستی کے فرمودات پر عمل اور اُس کی سنت کی پیروی آج مسلمان کے لیے مشکل ترین کام بن گیا ہے۔ کمالِ مہربانی سے ماہ ربیع الاوّل حضور ﷺ کو الاٹ کر دیا گیا ہے' جب نعت بھی ہوگی' آپؐ کے اوصافِ حمیدہ کا چرچا بھی ہوگا' لیکن فرد اور معاشرہ کی سطح پر کوئی عملی تبدیلی رونما نہیں ہوگی۔

۱۲ ربیع الاوّل پہلے بارہ وفات کہلاتی تھی' پھر عید میلاد النبیؐ بن گئی۔ لیکن ہم اِس بحث میں نہیں الجھتے کہ آپ ﷺ کی حقیقی تاریخ پیدائش یہی ہے یا نہیں! مؤرخین کی اکثریت ربیع الاوّل کی مختلف تاریخیں بتاتی ہے۔ بعض محققین ربیع الاوّل کے علاوہ دوسرے مہینوں کا

ذکر بھی کرتے ہیں۔ ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ روزِ قیامت کسی مسلمان سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ بتاؤ ہم نے کس ماہ اور کس دن اپنے محبوب کو دنیا میں بھیجا تھا اور تم نے اُس روز جشن منایا تھا یا نہیں؟ آپؐ کی ولادت کا جشن منانے والوں کی خدمتِ عالیہ میں عرض ہے کہ وہ امتِ مسلمہ کے نوجوانوں کو یہ بھی بتائیں کہ یومِ طائف آپؐ پر کیا گزری تھی؟ حرم شریف میں حالتِ سجدہ میں آپؐ کے سر مبارک پر اونٹ کی اوجڑی رکھ دی گئی تھی۔ آپؐ اپنے قبیلہ سمیت شعبِ ابی طالب میں تین سال قید رہے اور معاشی بائیکاٹ کا سامنا کیا' جس کے دوران آپؐ اور اہلِ قبیلہ درختوں کے پتے چباتے اور سوکھے ہوئے چمڑے اُبال کر اُس کا پانی پیتے رہے تاکہ جان وجسم کا رشتہ برقرار رکھا جاسکے۔ غزوۂ اُحد میں دندانِ مبارک بھی شہید ہوئے۔ لیکن اِس سب کچھ کے باوجود آپ اپنے مقدس مشن سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہ ہوئے۔ اِسی طرح لالچ اور ترغیب کے تمام ہتھکنڈوں کے جواب میں فرمایا کہ اگر تم میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے ہاتھ پر سورج بھی رکھ دو تب بھی احکاماتِ خداوندی سے سرِمُو انحراف نہیں کروں گا۔ آپ ﷺ پر درود بھیجنا کہ یہ سنت اللہ ہے اور آپؐ کے اوصاف اور محاسن کا ذکر کرنا یقیناً عبادت ہے' لیکن اس کے باوجود آپؐ کے احکامات پر عمل پیرا ہونے سے گریز کرنا اور سنتِ نبویؐ کو اپنانے سے راہِ فرار اختیار کرنا کھلی منافقت ہے اور اللہ ربّ العزت کو منافقت سے شدید نفرت ہے۔ اسی لیے اُس نے جہنم کی بدترین وادی کو منافقوں کا ٹھکانا بنایا ہے۔

خطبہ حجۃ الوداع کا غور سے مطالعہ کریں۔ حضور ﷺ نے جہاں اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی کا گواہ مسلمانوں کے انبوہِ کثیر کو بنایا وہاں امت کو یہ ذمہ داری بھی سونپی کہ وہ اِس دعوت کو دنیا بھر میں پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔ ہم غور کرنے کی تکلیف گوارا کریں تو بڑی آسانی سے اِس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اُمتِ مسلمہ آج ذلت ورسوائی سے کیوں دوچار ہے' دشمن کا خوف ہمارے اذہان وقلوب پر کیوں مسلط ہے اور شکست اور ہزیمت ہمارا مقدر کیوں ٹھہر گیا ہے؟ اس لیے کہ محسنِ انسانیت ﷺ سے ہماری زبانی محبت' اطاعت کی آمیزش نہیں رکھتی۔ نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت اللہ کی کبریائی کو دنیا میں کارفرما کرنا اور اُس نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنا تھا جس کے بنیادی اصول وقواعد اللہ ربّ العزت نے اپنی آخری کتاب میں نازل کر دیے تھے۔ پھر یہ کہ اُمتِ مسلمہ کو اُمتِ وسط قرار دیا تھا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اِس کا بنیادی فریضہ بتایا گیا تھا۔ لیکن یہ قوم دوسروں کو معروف

(باقی صفحہ 82 پر)

سُورۃُ النِّساء

آیات ۱۱۶ تا ۱۲۶

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ
يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ
وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۝ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ
عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ
اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ۝ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ
الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ۝
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝
لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا
يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ
ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۝
وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ
حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ۧ

ع ۱۵

آیت ۱۱۶ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ ''اللہ ہرگز نہیں بخشے گا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے' اور بخش دے گا اس کے سوا جس کے لیے چاہے گا۔''

گویا یہ بھی کوئی فری لائسنس نہیں ہے۔ یاد رہے کہ یہ آیت اس سورۂ مبارکہ میں دوسری بار آ رہی ہے۔

﴿وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ﴿۱۱۶﴾﴾ ''اور جو شرک کرتا ہے اللہ کے ساتھ وہ تو پھر گمراہ ہو گیا اور گمراہی میں بھی بہت دور نکل گیا۔''

آیت ۱۱۷ ﴿اِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ یَّدْعُوْنَ اِلَّا شَیْطٰنًا مَّرِیْدًا ﴿۱۱۷﴾﴾ ''نہیں پکارتے یہ لوگ اللہ کے سوا مگر دیویوں کو' اور وہ نہیں پکارتے کسی کو سوائے سرکش شیطان کے۔''

یہاں پہلی مرتبہ مشرکینِ مکہ کی بات بھی ہو رہی ہے۔ مشرکینِ مکہ نے اپنی دیویوں کے مؤنث نام رکھے ہوئے تھے' جیسے لات' منات' عُزّیٰ وغیرہ۔ لیکن اصل میں نہ لات کا کوئی وجود ہے اور نہ ہی منات کی کچھ حقیقت ہے۔ البتہ شیطان ضرور موجود ہے جو ان کی پکار سن رہا ہے۔

آیت ۱۱۸ ﴿لَّعَنَهُ اللّٰهُ﴾ ''اللہ نے اُس پر لعنت فرما دی ہے۔''

﴿وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾﴾ ''اور اُس نے کہا (اے اللہ) میں تیرے بندوں میں سے ایک مقرر حصہ تو لے کر ہی چھوڑوں گا۔''

ان لوگوں کو میں اپنے ساتھ جہنم میں پہنچا کر رہوں گا۔ گویا: ع

''ہم تو ڈوبے ہیں صنم' تم کو بھی لے ڈوبیں گے!''

آیت ۱۱۹ ﴿وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّیَنَّهُمْ﴾ ''اور میں لازماً ان کو بہکاؤں گا اور ان کو بڑی بڑی امیدیں دلاؤں گا''

ان کے دلوں میں بڑی اُمیدوں کے چراغ روشن کروں گا کہ یہ بہت تابناک کیریئر ہے' لگے رہو اسی کام میں' اس میں بڑا فائدہ ہے' ناجائز ہے تو خیر ہے' اللہ بخش ہی دے گا۔ ہم تو اللہ کے پیارے رسول ﷺ کے اُمتی ہیں' ہمیں خوف کس بات کا ہے؟ جس طرح یہودیوں کو یہ زعم ہو گیا تھا کہ ہم تو اللہ کے بیٹے ہیں' ہم اس کے بڑے چہیتے ہیں' وغیرہ۔ ان کو میں اس طرح کی

لمبی لمبی امیدوں اور لمبے لمبے منصوبوں میں اُلجھا دوں گا۔ اسی کو 'طولِ اَمل' کہتے ہیں۔

﴿وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ﴾ ''اور میں انہیں حکم دوں گا تو (اس کی تعمیل میں) وہ چوپایوں کے کان چیر دیں گے''

اس کی تفصیل سورۃ الانعام میں آئے گی کہ فلاں بُت یا فلاں دیوی کے نام پر کسی جانور کے کان چیر کر اسے آزاد کر دیا گیا ہے' اب اس کو کوئی چھیڑ نہیں سکتا' اس کا گوشت نہیں کھایا جا سکتا' اس پر سواری نہیں ہو سکتی۔

﴿وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ ''اور میں انہیں حکم دوں گا تو (اس کی تعمیل میں) وہ اللہ کی تخلیق میں تبدیلی کریں گے۔''

جیسے آج جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مَردوں میں عورتوں کے سے انداز اپنائے جا رہے ہیں اور عورتوں میں مَردوں کے سے طور طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں۔ لیکن سائنس کے میدان میں' خاص طور پر Genetics میں جو کچھ آج ہو رہا ہے وہ تو بہت ہی نازک صورتِ حال ہے۔ سائنسی ترقی کے سبب انسان آج اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ وہ اپنا اختیار استعمال کر کے جینیاتی تبدیلیوں کے ذریعے سے اللہ کی تخلیق میں تغیّر و تبدّل کر رہا ہے۔

﴿وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿١١٩﴾﴾

''اور جس کسی نے بھی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا دوست بنا لیا تو وہ بہت کھلے خسارے (اور تباہی) میں پڑ گیا۔''

آیت ۱۲۰ ﴿يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿١٢٠﴾﴾ ''وہ (شیطان) ان سے وعدے بھی کرتا ہے اور انہیں اُمیدیں بھی دلاتا ہے' اور نہیں وعدہ کرتا ان سے شیطان مگر دھوکے کا۔''

شیطان ان کو وعدوں کے بہلاوے دیتا ہے اور آرزوؤں میں پھنساتا ہے' سبز باغ دکھاتا ہے' مگر شیطان کے دعوے سراسر فریب ہیں۔

آیت ۱۲۱ ﴿اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿١٢١﴾﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے' اور وہاں سے وہ فرار کی کوئی صورت نہیں پائیں گے۔''

وہاں سے بھاگنے کا انہیں کوئی راستہ نہیں ملے گا۔ دوسری طرف اہلِ ایمان کی شان کیا

ہوگی' اگلی آیت میں اس کی تفصیل ہے۔ دو گروہوں یا دو پہلوؤں کے درمیان فوری تقابل (simultaneous contrast) کا یہ انداز قرآن میں ہمیں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

آیت ۱۲۲ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں انہیں ہم عنقریب داخل کریں گے ایسے باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی''

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ ''ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

﴿وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴾ ''اللہ کا یہ وعدہ سچا ہے' اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنی بات میں سچا ہو سکتا ہے؟''

آیت ۱۲۳ ﴿لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ﴾ ''(اے مسلمانو!) نہ تمہاری خواہشات پر (موقوف ہے) اور نہ اہلِ کتاب کی خواہشات پر۔''

تنبیہہ آ گئی کہ تمہارے اندر بھی بلا جواز اور بے بنیاد خواہشات پیدا ہو جائیں گی۔ یہود و نصاریٰ کی طرح تم لوگ بھی بڑی دل خوش کن آرزوؤں (wishful thinkings) کے عادی ہو جاؤ گے' شفاعت کی امید پر تم بھی حرام خوریاں کرو گے' اللہ کی نافرمانیاں جیسی کچھ انہوں نے کی تھیں تم بھی کرو گے۔ لیکن جان لو کہ اللہ کا قانون اٹل ہے' بدلے گا نہیں۔ تمہاری خواہشات سے' تمہاری آرزوؤں سے اور تمہاری تمناؤں سے کچھ نہیں ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے اہلِ کتاب کی خواہشات سے کچھ نہیں ہوا۔ بلکہ:

﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ﴾ ''جو کوئی بُرا کام کرے گا اس کی سزا اس کو مل کر رہے گی''

اگرچہ اللہ کے ہاں اس قانون میں نرمی کا ایک پہلو موجود ہے' لیکن اپنی جگہ یہ بہت سخت الفاظ ہیں۔ بعض اوقات بدی کی جگہ پر نیکی اُس کے منفی اثرات کو دھو دیتی ہے' لیکن اس آیت کی رو سے برائی کا حساب تو ہو کر رہنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان سے جس بدی کا ارتکاب ہوتا ہے وہ اس کے بارے میں جواب دہ ہے' اس کا احتساب ہو کر رہے گا۔ اگر کسی کی نیکی نے اس کی بدی کو چھپا بھی لیا' کسی نے غلطی کی اور پھر صدقِ دل سے توبہ کر لی تو اس کے سبب اس کی بدی کے اثرات جاتے رہے' لیکن معاملہ account for ضرور ہوگا۔ توبہ کو دیکھا جائے

گا' کہ آیا توبہ واقعتاً سچی تھی؟ توبہ کرنے والا اپنے کیے پر نادم ہوا تھا؟ واقعی اس نے عادتِ بد کو چھوڑ دیا تھا؟ یا صرف زبان سے ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَیْہِ'' کی گردان ہو رہی تھی اور ساتھ نافرمانی اور حرام خوری بھی جوں کی توں چل رہی تھی۔ تو احتساب کے کٹہرے میں ہر شخص اور ہر معاملے کو لایا جائے گا اور کھرا کھوٹا دیکھ کر فیصلہ کیا جائے گا۔ پھر جو مجرم پایا گیا' اسے اس کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔

﴿وَلَا یَجِدْ لَہٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ﴿۱۲۳﴾﴾ ''اور وہ نہیں پائے گا اپنے لیے اللہ کے مقابلے میں کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار۔''

آیت ۱۲۴ ﴿وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ﴾ ''اور جو کوئی نیک عمل کرے گا' خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور ہو وہ صاحبِ ایمان''

﴿فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا ﴿۱۲۴﴾﴾ ''تو یہ وہ لوگ ہیں جو جنّت میں داخل ہوں گے اور ان کی تل کے برابر بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔''

آیت ۱۲۵ ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ﴾ ''اور اُس سے بہتر دین کس کا ہو گا جس نے اپنا چہرہ (سر) اللہ کے سامنے جھکا دیا' اور (اس کے بعد) احسان (کے درجے) تک پہنچ گیا''

اللہ کی بندگی میں خوبصورتی لا کر' خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ' پورے دین کا اتباع کر کے' تفریق بین الدّین سے بچ کر اور total submission کے ذریعے سے اُس نے احسان کے درجے تک رسائی حاصل کر لی۔

﴿وَّاتَّبَعَ مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا﴾ ''اور اُس نے پیروی کی دینِ ابراہیمؑ کی یکسو ہو کر (یا پیروی کی اُس ابراہیمؑ کے دین کی' جو یکسو تھا)۔''

﴿وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا ﴿۱۲۵﴾﴾ ''اور اللہ نے تو ابراہیم کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔''

آیت ۱۲۶ ﴿وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا ﴿۱۲۶﴾﴾ ''اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے' اور اللہ تعالیٰ ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔''

آیات ۱۲۷ تا ۱۳۴

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي
الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَاۗءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ
تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۭ
وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ۝ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ
بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ
وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ
كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ وَلَوْ
حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ
وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا
فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ۝ وَلِلّٰهِ مَا
فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا
النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي ذٰلِكَ قَدِيْرًا ۝ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ
ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ ع ۱۹/۸/۱۶

اب جو آیات آ رہی ہیں ان میں خطاب مسلمانوں ہی سے ہے لیکن ان کی حیثیت ''استدراک'' کی ہے اور ان کا تعلق اس سورۃ کی ابتدائی آیات کے ساتھ ہے۔ سورۃ النساء کے آغاز میں خواتین کے مسائل کے بارے میں کچھ احکام نازل ہوئے تھے جن میں یتیم بچیوں سے نکاح کے بارے میں بھی معاملات زیر بحث آئے تھے اور کچھ طلاق وغیرہ کے مسائل تھے۔

اس میں کچھ نکات لوگوں کے لیے وضاحت طلب تھے لہٰذا ایسے نکات کے بارے میں مسلمانوں کی طرف سے کچھ سوالات کیے گئے اور حضور ﷺ سے کچھ وضاحتیں طلب کی گئیں۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ وضاحتیں نازل کی ہیں اور اس سوال کا حوالہ دے کر بات شروع کی گئی ہے جس کا جواب دیا جانا مقصود ہے۔

آیت ۱۲۷ ﴿وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ﴾ ''(اے نبیؐ) یہ لوگ آپؐ سے عورتوں کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔''

﴿قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ﴾ ''کہہ دیجیے کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے (وضاحت کرتا ہے) ان کے بارے میں''

﴿وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ﴾ ''اور جو تمہیں (پہلے سے) سنایا جا رہا ہے کتاب میں یتیم لڑکیوں کے بارے میں''

یہ اسی سورۃ کی آیت ۳ کی طرف اشارہ ہے۔ آیت زیر نظر کے ساتھ مل کر اُس آیت کی تشریح بھی بالکل واضح ہو گئی اور ثابت ہو گیا کہ وہاں جو فرمایا گیا تھا ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى﴾ تو اس سے اصل مراد ''يَتٰمَى النِّسَآءِ'' تھا۔ یعنی اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں سے شادی کرو گے تو ان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے (اس لیے کہ ان کی طرف سے کوئی نہیں جو ان کے حقوق کا پاسدار ہو اور تم سے باز پرس کر سکے) تو پھر ان سے شادی مت کرو بلکہ دوسری عورتوں سے شادی کر لو۔ اگر ایک سے زائد نکاح کرنا چاہتے ہو تو اپنی پسند کی دوسری عورتوں سے، دو دو، تین تین یا چار چار سے کر لو ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾۔ مگر ایسی بے سہارا یتیم لڑکیوں سے نکاح نہ کرو، کیونکہ:

﴿الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ﴾ ''جن کو تم دیتے نہیں ہو جو اللہ نے اُن کے لیے لکھ دیا ہے اور چاہتے ہو کہ ان سے نکاح بھی کرو''

یتیم سمجھ کر مہر ادا کیے بغیر ان سے نکاح کرنے کے خواہش مند رہتے ہو۔

﴿وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ﴾ ''اور (اسی طرح) وہ بچے جو کمزور ہیں (جن پر ظلم ہوتا ہے)''

﴿وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ﴾ ''اور یہ (ہم نے تمہیں اتنے تفصیلی احکام

دیے ہیں) کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف پر کاربند رہو۔''

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿١٢٧﴾﴾ ''اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اس سے واقف ہے۔''

وہ تمہاری نیتوں کو جانتا ہے۔ اُس نے شریعت کے احکام نازل کر دیے ہیں' بنیادی ہدایات تمہیں دے دی گئی ہیں۔ اب اضافی چیز تو بس یہی ہے کہ تمہاری نیت صاف ہونی چاہیے۔ کیونکہ ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ﴾ (البقرۃ:۲۲۰) اللہ جانتا ہے کہ کون حقیقت میں شرارتی ہے اور کس کی نیت صحیح ہے۔

آیت ۱۲۸ ﴿وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا﴾ ''اور اگر کسی عورت کو اندیشہ ہو اپنے شوہر سے زیادتی یا بے رُخی کا''

ایک ''نشوز'' تو وہ تھا جس کا تذکرہ اسی سورۃ کی آیت ۳۴ میں عورت کے لیے ہوا تھا: ﴿وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ﴾ ''اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو''۔ یعنی وہ عورتیں' وہ بیویاں جو خاوندوں سے سرکشی کرتی ہیں' ان کے احکام نہیں مانتیں' ان کی اطاعت نہیں کرتیں' اپنی ضد پر اڑی رہتی ہیں' ان کے بارے میں حکم تھا کہ اُن کے ساتھ کیسا معاملہ کیا جائے۔ اب یہاں ذکر ہے اُس ''نشوز'' کا جس کا اظہار خاوند کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ خاوند اپنی بیوی پر ظلم کر رہا ہو' اس کے حقوق ادا کرنے میں پہلوتہی کر رہا ہو' اپنی ''قوامیت'' کے حق کو غلط طریقے سے استعمال کر رہا ہو' بے جا رُعب ڈالتا ہو' دھونس دیتا ہو' یا بلاوجہ ستاتا ہو' تنگ کرتا ہو' اور تنگ کر کے مہر معاف کروانا چاہتا ہو' یا اگر بیوی کے والدین اچھے کھاتے پیتے ہوں تو ہو سکتا ہے اسے بلیک میل کر کے اس کے والدین سے دولت ہتھیانا چاہتا ہو۔ یہ ساری خباثتیں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں اور عورتیں بیچاری ظلم و ستم کی اس چکی میں پستی رہتی ہیں۔ آیت زیر نظر میں اس مسئلے کی وضاحت کی گئی ہے کہ اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے اندیشہ ہو جائے کہ وہ زیادتی کرے گا' یا اگر شوہر زیادتی کر رہا ہو اور وہ بیوی کے حقوق ادا نہ کر رہا ہو' یا اس کی طرف میلان ہی نہ رکھتا ہو' کوئی نئی شادی رچالی ہو اور اب ساری توجہ نئی دلہن کی طرف ہو۔

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا﴾ ''تو ان دونوں پر کوئی الزام نہیں ہوگا کہ وہ آپس میں صلح کر لیں۔''

یہاں صلح سے مراد یہ ہے کہ سارے معاملات باہم طے کر کے عورت خلع لے لے۔ لیکن خلع لینے میں' جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں' عورت کو مہر چھوڑنا پڑے گا' اور اگر لیا تھا تو کچھ واپس کرنا پڑے گا۔

﴿وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۗ وَأُحْضِرَتِ الْأَنفُسُ الشُّحَّ ۚ﴾ ''اور صلح بہر حال بہتر ہے۔ البتہ انسانی نفس پر لالچ مسلط رہتا ہے۔''

مرد چاہے گا کہ میرا پورا مہر واپس کیا جائے' جبکہ عورت چاہے گی کہ مجھے کچھ بھی واپس نہ کرنا پڑے۔ یہ مضامین سورۃ البقرۃ میں بیان ہو چکے ہیں۔

﴿وَإِن تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٢٨﴾﴾ ''اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو جان لو کہ اللہ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔''

تم مرد ہو' مردانگی کا ثبوت دو' اس معاملے میں اپنے اندر نرمی پیدا کرو' بیوی کا حق فراخ دلی سے ادا کرو۔

آیت ۱۲۹ ﴿وَلَن تَسْتَطِيعُوا أَن تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ﴾ ''اور تمہارے لیے ممکن ہی نہیں کہ تم عورتوں کے درمیان پورا پورا انصاف کر سکو' چاہے تم اس کے لیے کتنے ہی حریص ہو''

سورۃ کے آغاز (آیت ۳) میں فرمایا گیا تھا: ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً﴾ یعنی اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم اپنی بیویوں میں (اگر ایک سے زائد ہیں) عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک پر ہی اکتفا کرو' دوسری شادی مت کرو۔ اگر تمہیں کلی طور پر اطمینان ہے' اپنے اوپر اعتماد ہے کہ تم عدل کر سکتے ہو تب دوسری شادی کرو' ورنہ نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کچھ چیزیں تو گنتی اور ناپ تول کی ہوتی ہیں' ان میں تو عدل کرنا ممکن ہے' لیکن جو قلبی میلان ہے یہ تو انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے اپنی تمام ازواج کے لیے ہر چیز گن گن کر طے کی ہوئی تھی۔ شب بسری کے لیے سب کی باریاں مقرر تھیں۔ دن میں بھی آپؐ ہر گھر میں چکر لگاتے تھے۔ عصر اور مغرب کے درمیان تھوڑی تھوڑی دیر ہر زوجہ محترمہ کے پاس ٹھہرتے تھے۔ اگر کہیں زیادہ دیر ہو جاتی تو گویا کھلبلی مچ جاتی تھی کہ آج وہاں زیادہ دیر کیوں ٹھہر گئے؟ یہ چیزیں انسانی معاشرے میں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا آپس

کا معاملہ بہت اچھا تھا' لیکن سوکنا پے کے اثرات کچھ نہ کچھ تو ہوتے ہیں' یہ عورت کی فطرت ہے' جو اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ تو اس لیے فرمایا کہ مکمل انصاف کرنا تمہارے بس میں نہیں۔ اس سے مراد دراصل قلبی میلان ہے۔ ایک حدیث میں بھی اس کی وضاحت ملتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ میں نے ظاہری چیزوں میں پورا پورا عدل کیا ہے' باقی جہاں تک میرے دل کے میلان کا تعلق ہے تو مجھے امید ہے کہ اس بارے میں تُو مجھ سے مواخذہ نہیں کرے گا۔ اسی لیے یہاں فرمایا گیا کہ تم چاہو بھی تو عدل نہیں کر سکتے۔

﴿فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ﴾ ''تو ایسا نہ ہو کہ تم ایک ہی کی طرف پورے کے پورے جھک جاؤ کہ دوسری بیوی کو معلّق کر کے چھوڑ دو۔''

دوسری بیوی اس طرح معلّق ہو کر نہ رہ جائے کہ اب وہ نہ شوہر والی ہے اور نہ آزاد ہے۔ اس سے خاوند کا گویا کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔

﴿وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۲۹﴾ ''اور اگر تم اصلاح کر لو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ بھی غفور اور رحیم ہے۔''

اب اگلی آیت میں طلاق کے معاملے میں ایک اہم نکتہ بیان ہو رہا ہے۔ طلاق یقیناً ایک نہایت سنجیدہ مسئلہ ہے' اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى الطَّلَاقُ)) (۱) ''حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے''۔ لیکن ہمارے معاشرے میں اس کو بسا اوقات کفر تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ لڑائیاں ہو رہی ہیں' مقدمات چل رہے ہیں' مزاجوں میں موافقت نہیں ہے' ایک دوسرے کو کوس رہے ہیں' دن رات کا جھگڑا ہے' لیکن طلاق نہیں دیتی۔ یہ طرزِ عمل نہایت احمقانہ ہے اور شریعت کی منشاء کے بالکل خلاف بھی۔ اس آیت میں آپ دیکھیں گے کہ ایک طرح سے طلاق کی ترغیب دی گئی ہے۔

آیت ۱۳۰ ﴿وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ﴾ ''اور اگر وہ (میاں بیوی) دونوں علیحدہ ہو جائیں گے تو اللہ ان کو اپنی کشادگی سے غنی کر دے گا۔''

ہو سکتا ہے کہ اس عورت کو بھی کوئی بہتر رشتہ مل جائے جو اس کے ساتھ مزاجی موافقت

(۱) سنن ابی داؤد' کتاب الطلاق' باب فی کراھیۃ الطلاق۔ وسنن ابن ماجہ' کتاب الطلاق' باب حدثنا سوید بن سعید۔ راوی: عبد اللّٰہ بن عمر رضی اللہ عنہ

رکھنے والا ہو اور اس شوہر کو بھی اللہ تعالیٰ کوئی بہتر بیوی دے دے۔ میاں بیوی کا ہر وقت لڑتے رہنا' دنگا فساد کرنا اور عدمِ موافقت کے باوجود طلاق کا اختیار (option) استعمال نہ کرنا' یہ سوچ ہمارے ہاں ہندو معاشرت اور عیسائیت کے اثرات کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ہندومت کی طرح عیسائیت میں بھی طلاق حرام ہے۔ دراصل انجیل میں تو شریعت اور قانون ہے ہی نہیں' صرف اخلاقی تعلیمات ہیں۔ چنانچہ جس طرح نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقُ)) ایسی ہی کوئی بات حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی فرمائی تھی کہ کوئی شخص بلاوجہ اپنی بیوی کو طلاق نہ دے کہ معاشرے میں اس کے منفی اثرات مرتب ہونے کا اندیشہ ہے۔ طلاق شدہ عورت کی دوسری شادی نہ ہونے کی صورت میں اس کے آوارہ ہو جانے کا امکان ہے اور اگر ایسا ہوا تو اس کا وبال اسے بلاوجہ طلاق دینے والے کے سر جائے گا۔ لیکن یہ محض اخلاقی تعلیم تھی' کوئی قانونی شق نہیں تھی۔ عیسائیت کا قانون تو وہی ہے جو تورات کے اندر ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام فرما گئے ہیں کہ یہ نہ سمجھو کہ میں قانون کو ختم کرنے آیا ہوں' بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت تم پر بدستور نافذ رہے گی۔ قانون بہرحال قانون ہے' اخلاقی ہدایات کو قانون کا درجہ تو نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن عیسائیت میں اس طرح کی اخلاقی تعلیمات کو قانون بنا دیا گیا' جس کی وجہ سے بلاجواز پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ ان کے ہاں کوئی شخص اپنی بیوی کو اُس وقت تک طلاق نہیں دے سکتا جب تک اس پر بدکاری کا جرم ثابت نہ کرے۔ لہٰذا وہ طلاق دینے کے لیے طرح طرح کے طریقے استعمال کر کے بیوی کو پہلے بدکردار بناتے ہیں' پھر اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں' تب جا کر اس سے جان چھڑاتے ہیں۔ تو شریعت کے درست اور آسان راستے اگر چھوڑ دیے جائیں تو پھر اسی طرح غلط اور مشکل راستے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں عدمِ موافقت کی صورت میں طلاق کے بارے میں ایک طرح کی ترغیب نظر آتی ہے۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ۝۱۳۰﴾ ''اور اللہ بڑی وسعت رکھنے والا' حکمت والا ہے۔''

اللہ کے خزانے بڑے وسیع ہیں اور اس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

آیت ۱۳۱ ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ﴾ ''اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔''

﴿وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ''اور (دیکھو مسلمانو!) تم سے پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی انہیں بھی ہم نے وصیت کی تھی اور اب تمہیں بھی یہی وصیت ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔''

احکامِ شریعت کی تعمیل کے سلسلے میں اصل جذبۂ محرکہ تقویٰ ہے۔ تقویٰ کے بغیر شریعت بھی مذاق بن جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ کے ایک خطبہ کے یہ الفاظ بہت مشہور ہیں اور خطباتِ جمعہ میں بھی اکثر انہیں شامل کیا جاتا ہے: ((اُوْصِيْكُمْ وَنَفْسِيْ بِتَقْوَى اللّٰهِ))(۱) ''مسلمانو! میں تمہیں بھی اور اپنے نفس کو بھی اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں''۔ قرآن حکیم میں جابجا اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ سورۃ التحریم میں ارشاد ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (آیت:۶) ''اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے''۔ یہاں بھی تقویٰ کا حکم انتہائی تاکید کے ساتھ دیا جا رہا ہے۔

﴿وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ۝﴾ ''اور اگر تم نہ مانو گے تو (یاد رکھو کہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ ہی کا ہے' اور اللہ تعالیٰ تو خود غنی ہے' اپنی ذات میں خود ستودہ صفات ہے۔''

آیت ۱۳۲ ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝﴾ ''اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا ہے' اور اللہ کافی ہے کارساز ہونے کے اعتبار سے۔''

اگر میاں بیوی میں واقعی نباہ نہیں ہو رہا تو بے شک وہ علیحدگی اختیار کر لیں' دونوں کا کارساز اللہ ہے۔ عورت بھی یہ سمجھے کہ میرا شوہر مجھ پر جو ظلم کر رہا ہے اور میرے ساتھ انصاف نہیں کر رہا ہے' اس صورت میں اگر میں اس سے تعلق منقطع کر لوں گی تو اللہ کارساز ہے' وہ میرے لیے کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔ اور اسی طرح کی سوچ مرد کی بھی ہونی چاہیے۔ اس کے

(۱) یہ الفاظ اگرچہ مشہور ہیں لیکن دستیاب کتبِ احادیث میں ان کا حوالہ نہیں مل سکا۔ البتہ ((اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ)) کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کے خطبات میں بکثرت ملتے ہیں۔ مثلاً:
سنن الترمذی' ابواب العلم' باب ما جاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع۔ وسنن ابی داؤد' کتاب السنة' باب فی لزوم السنة۔ (مرتب)

برعکس یہ سوچ انتہائی احمقانہ اور خلافِ شریعت ہے کہ ہر صورت میں عورت سے نباہ کرنا ہے' چاہے اللہ سے بغاوت ہی کیوں نہ ہو جائے۔ لہٰذا ہر چیز کو اُس کے مقام پر رکھنا چاہیے۔

آیت ۱۳۳ ﴿اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ اَیُّهَا النَّاسُ وَیَاْتِ بِاٰخَرِیْنَ ؕ﴾ ''اے لوگو! وہ چاہے تو تم سب کو لے جائے اور دوسرے لوگوں کو لے آئے۔''

اللہ کے مقابلے میں تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے سامنے تم سب نفسِ واحد کی طرح ہو' جب چاہے اللہ تعالیٰ سب کو نسیاً منسیاً کر دے اور نئے لوگوں کو پیدا کر دے۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِیْرًا ﴿۱۳۳﴾﴾ ''اور یقیناً اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے۔''

آیت ۱۳۴ ﴿مَنْ كَانَ یُرِیْدُ ثَوَابَ الدُّنْیَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ﴾ ''جو کوئی بھی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو اللہ کے پاس ہے ثواب دنیا کا بھی اور آخرت کا بھی۔''

جو شخص اپنی ساری بھاگ دوڑ اور دن رات کی محنت دنیا کمانے' دولت اور جائیداد بڑھانے' عہدوں میں ترقی پانے اور مادی طور پر پھلنے پھولنے میں لگا رہا ہے' دوسری طرف اللہ کے احکام اور حقوق کو نظر انداز کر رہا ہے' اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس تو دنیا کے خزانے بھی ہیں اور آخرت کے بھی۔ اور یہ کہ وہ صرف دنیاوی چیزوں کی خواہش کر کے گویا سمندر سے قطرہ حاصل کرنے پر اکتفا کر رہا ہے۔ بقولِ علامہ اقبالؔ ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

لہٰذا اللہ سے دنیا بھی مانگو اور آخرت بھی۔ اور اس طرح مانگو جس طرح اس نے مانگنے کا طریقہ بتایا ہے: ﴿رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾﴾ (البقرۃ)۔ تم لوگ اللہ کے ساتھ اپنے معاملات کو درست کرو' اس کے ساتھ اپنا تعلق خلوص و اخلاص کی بنیادوں پر استوار کرو' اس کی طرف سے جو ذمہ داریاں ہیں ان کو ادا کرو' پھر اللہ تعالیٰ یقیناً دنیا میں بھی نوازے گا اور آخرت میں بھی۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ﴿۱۳۴﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

آیات ۱۳۵ تا ۱۴۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ
الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا
تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
خَبِيْرًا ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى
رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ
وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا
ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ
سَبِيْلًا ۝ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَۨا ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ
الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ
الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ
يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۚ
اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَۨا ۝
الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ
مَّعَكُمْ ۠ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ
مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝ ع ۱۷

آیت ۱۳۵ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ ''اے اہلِ ایمان! کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر''

یہ آیت قرآن کریم کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ سورۂ آل عمران (آیت ۱۸) میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَاۗىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ۭ﴾ ''اللہ گواہ ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور سارے فرشتے اور اہلِ علم بھی اس

پر گواہ ہیں' وہ عدل کا قائم کرنے والا ہے''۔ اللہ تعالیٰ اس زمین پر عدل قائم کرنا چاہتا ہے' اس کے لیے وہ اپنے دین کا غلبہ چاہتا ہے' اور اس عظیم کام کے لیے اُس کے کارندے اور سپاہی اہلِ ایمان ہی ہیں۔ انہی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اس دنیا میں عدل قائم کرے گا۔ لیکن اہلِ ایمان کو اس عظیم مقصد کے لیے کوشش کرنی ہوگی' جانوں کا نذرانہ پیش کرنا ہوگا' ایثار کرنا ہوگا' قربانیاں دینی ہوں گی' تب جا کر کہیں دین غالب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ بہت ہی اہم معاملہ ہے۔ معاشرے میں عدل وقسط کے قیام کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ اس کے لیے جدوجہد کرنے والوں کو ''اللہ کے گواہ'' کہا گیا ہے۔ عدلِ اجتماعی (Social Justice) پر اسلام نے جتنا زور دیا ہے بدقسمتی سے آج ہمارا مذہبی طبقہ اتنا ہی اس سے بے بہرہ ہے۔ آج کے مسلم معاشروں میں سرے سے شعور ہی نہیں کہ عدلِ اجتماعی کی بھی کوئی اہمیت اسلام میں ہے۔ اسلامی قوانین اور حدود وتعزیرات کے نفاذ کی اہمیت تو سب جانتے ہیں' لیکن باطل نظام کی ناانصافیاں' یہ جاگیردارانہ ظلم وستم اور غریبوں کا استحصال (exploitation) کس طرح ختم ہوگا؟ سرمایہ دار غریبوں کا خون چوس چوس کر روز بروز موٹے ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ نظام ایک ایسی چکی ہے جو آٹا پیس پیس کر ایک ہی طرف ڈالتی جا رہی ہے' جبکہ دوسری طرف محرومی ہی محرومی ہے۔ یہاں دولت کی تقسیم کا نظام ہی غلط ہے' ایک طرف وسائل کی ریل پیل ہے تو دوسری طرف بھوک ہی بھوک۔ ایک طرف امیر امیر تر ہو رہے ہیں تو دوسری طرف غریب غریب تر' اور غربت تو ایسی لعنت ہے جو انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے' از روئے حدیثِ نبویؐ: ((كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَكُوْنَ كُفْرًا))(۱) لہٰذا سب سے پہلے وہ نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے جس میں عدل ہو' انصاف ہو' جس میں ضمانت دی گئی ہو کہ ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت ہوگی۔ کفالتِ عامہ کی یہ ضمانت نظامِ خلافت میں دی جاتی ہے۔ جب نظام درست ہو جائے تو پھر حدود وتعزیرات کا نفاذ ہو۔ پھر جو کوئی چوری کرے اس کا ہاتھ کاٹا جائے۔ لیکن موجودہ حالات میں اگر اسلامی قوانین نافذ ہوں گے تو ان کا فائدہ اُلٹا لٹیروں اور حرام خوروں کو ہوگا' بلیک مارکیٹنگ کرنے والے ان سے مستفید ہوں گے۔ جنہوں نے حرام خوری سے دولت جمع کر رکھی ہے' وہ خوب پاؤں پھیلا کر سوئیں گے۔ چور کا ہاتھ کٹے گا تو انہیں چوری کا ڈر

(۱) رواه البيهقي في شعب الايمان۔ بحواله مشكوٰة المصابيح' كتاب الآداب' باب ما ينهى عنه من التهاجر والتقاطع واتباع العورات ۔ راوی : انس بن مالك ﷺ

رہے گا نہ ڈاکے کا۔ تو اصل کام نظام کا بدلنا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ (معاذ اللہ) شریعت نافذ نہ کی جائے' بلکہ مقصد یہ ہے کہ شریعت نافذ کرنے سے پہلے نظام (system) کو بدلا جائے' دین کا نظام قائم کیا جائے اور پھر اس نظام کو قائم رکھنے کے لیے' اس کو مستحکم اور مضبوط کرنے کے لیے' اسے مستقل طور پر چلانے کے لیے قانون نافذ کیا جائے۔ کیونکہ قانون ہی کسی نظام کے استحکام کا ذریعہ بنتا ہے' قانون کے صحیح نفاذ سے ہی کوئی نظام مضبوط ہوتا ہے۔

یہی مضمون آگے چل کر سورۃ المائدۃ (آیت ۸) میں بھی آئے گا' لیکن وہاں اس کی ترتیب بدل گئی ہے۔ وہاں ترتیب اس طرح ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾۔ اس ترتیب کے بدلنے میں ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ اللہ اور عدل وقسط گویا مترادف الفاظ ہیں۔ ایک جگہ حکم ہے ''گواہ بن جاؤ اللہ کے'' اور دوسری جگہ فرمایا: ''گواہ بن جاؤ قسط کے''۔ ایک جگہ فرمایا: ''کھڑے ہو جاؤ قسط (عدل وانصاف) کے لیے'' جبکہ دوسری جگہ ارشاد ہوا کہ ''کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے''۔ معلوم ہوا کہ اللہ اور قسط کے الفاظ جو ایک دوسرے کی جگہ آئے ہیں' آپس میں مترادف ہیں۔

﴿وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ﴾ ''خواہ یہ (انصاف کی بات اور شہادت) تمہارے اپنے خلاف ہو یا تمہارے والدین کے یا تمہارے قرابت داروں کے۔''

ایک مؤمن کا تعلق عدل وانصاف اور قسط کے ساتھ ہونا چاہیے' رشتہ داری کے ساتھ نہیں۔ یہاں پر حرفِ جار کے بدلنے سے معانی میں ہونے والی تبدیلی مدنظر رہے۔ شهادة علی کا مطلب ہے لوگوں پر گواہی' اُن کے خلاف گواہی' جبکہ شهادة لِلّٰه کا مطلب ہے اللہ کے لیے گواہی' لہٰذا شُهَدَآءَ لِلّٰه کے معنی ہیں اللہ کے گواہ۔

﴿اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا﴾ ''چاہے وہ شخص غنی ہے یا فقیر' اللہ ہی دونوں کا پشت پناہ ہے۔''

اللہ ہر کسی کا کفیل ہے' تم کسی کے کفیل نہیں ہو۔ تمہیں تو فیصلہ کرنا ہے جو عدل وانصاف پر مبنی ہونا چاہیے' تمہیں کسی کی جانب داری نہیں کرنی' نہ ماں باپ کی' نہ بھائی کی اور نہ خود اپنی۔ ایک چور دروازہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کا حق تو نہیں بنتا' لیکن یہ غریب ہے' لہٰذا اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے۔ فرمایا کہ فریقِ معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب' تمہیں اس کی جانب داری نہیں

کرنی۔ یہ حکم ہمیں واضح طور پر ہمارا فرض یاد دلاتا ہے کہ ہم سب اللہ کے گواہ بن کر کھڑے ہو جائیں۔ ہر حق بات جو اللہ کی طرف سے ہو اس کے علمبردار بن جائیں اور اس حق کو قائم کرنے کے لیے تن، من اور دھن کی قربانی دینے کے لیے اپنی کمر کس لیں۔

﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴾ ''تو تم خواہشات کی پیروی نہ کرو، مبادا کہ تم عدل سے ہٹ جاؤ۔ اگر تم زبانوں کو مروڑو گے یا اعراض کرو گے تو (یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل سے پوری طرح باخبر ہے۔''

یعنی اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا حق گوئی سے پہلوتہی کی تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ کو اس کی پوری پوری خبر ہے۔ ''تَلْوٗا'' کا صحیح مفہوم آج کی زبان میں ہوگا chewing your words ۔یعنی اس طریقے سے زبان کو حرکت دینا کہ بات کہنا بھی چاہتے ہیں لیکن کہہ بھی نہیں پا رہے ہیں، حق بات زبان سے نکالنا نہیں چاہتے، غلط بات نکل نہیں رہی ہے۔ یا پھر ویسے ہی حق بات کہنے والی صورتِ حال کا سامنا کرنے سے کنی کترا رہے ہیں، موقع سے ہی بچ نکلنا چاہتے ہیں۔ لیکن یاد رکھو کہ ایسی کسی کوشش سے انسانوں کو تو دھوکہ دیا جا سکتا ہے مگر اللہ تو تمہاری ہر سوچ، ہر نیت اور ہر حرکت سے باخبر ہے۔

اس کے بعد جو مضمون آ رہا ہے وہ شاید اس سورۂ مبارکہ کا اہم ترین مضمون ہے۔

آیت ۱۳۶ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ﴾ ''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر، اُس کے رسولؐ پر اور اُس کتاب پر جو اُس نے نازل فرمائی اپنے رسولؐ پر اور اُس کتاب پر جو اُس نے پہلے نازل فرمائی۔''

ایمان والوں سے یہ کہنا کہ ایمان لاؤ بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ ''اے ایمان والو! ایمان لاؤ!'' چہ معنی دارد؟ اس کا مطلب ہے کہ اقرار باللسان والا ایمان تو تمہیں موروثی طور پر حاصل ہو چکا ہے۔ مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہو گئے تو وراثت میں ایمان بھی مل گیا، یا یہ کہ جب پورا قبیلہ اسلام لے آیا تو اس میں پکے مسلمانوں کے ساتھ کچھ کچے مسلمان بھی شامل ہو گئے۔ انہوں نے بھی کہا: ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ''۔

اس طرح ایمان ایک درجے (اقرار باللسان) میں تو حاصل ہو گیا۔ یہ ایمان کا قانونی درجہ ہے۔ پیچھے اسی سورۃ (آیت ۹۴) میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ اگر کوئی شخص راستے میں ملے اور وہ اپنا اسلام ظاہر کرے تو تم اس کو یہ نہیں کہہ سکتے ہو کہ تم مؤمن نہیں ہو' کیونکہ جس نے زبان سے کلمۂ شہادت ادا کر لیا تو قانونی طور پر وہ مؤمن ہے۔ لیکن کیا حقیقی ایمان یہی ہے؟ نہیں' بلکہ حقیقی ایمان ہے یقینِ قلبی۔ اس لیے فرمایا: ''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر.....''۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے ہم اس آیت کا ترجمہ اس طرح کریں گے کہ ''اے اہلِ ایمان! ایمان لاؤ اللہ پر جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے' مانو رسول ﷺ کو جیسا کہ ماننے کا حق ہے.....'' اور یہ حق اُسی وقت ادا ہو گا جب اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان دل میں گھر کر گیا ہو۔ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں سورۃ الحجرات (آیت ۷) میں فرمایا گیا: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ ''اللہ نے ایمان کو تمہارے نزدیک محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں مُزیّن کر دیا ہے''۔ آگے چل کر اسی سورۃ (آیت ۱۴) میں کچھ لوگوں کے بارے میں یوں فرمایا: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ ''یہ بدّو لوگ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اے نبی (ﷺ) ان سے کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' ہاں یوں کہہ سکتے ہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں' لیکن ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''۔ چنانچہ اصل ایمان وہ ہے جو دل میں داخل ہو جائے۔ یہ درجہ تصدیق بالقلب کا ہے۔ یاد رہے کہ آیت زیرِ مطالعہ میں دراصل روئے سخن منافقین کی طرف ہے۔ وہ زبانی ایمان تو لائے تھے لیکن وہ ایمان اصل ایمان نہیں تھا' اس میں دل کی تصدیق شامل نہیں تھی۔ (عربی زبان سے واقفیت رکھنے والے حضرات یہ نکتہ بھی نوٹ کریں کہ قرآن کے لیے اس آیت میں لفظ نَزَّلَ اور تورات کے لیے اَنْزَلَ استعمال ہوا ہے۔)

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝﴾ ''اور جو کوئی کفر (انکار) کرے گا اللہ کا' اس کے فرشتوں کا' اس کی کتابوں کا' اس کے رسولوں کا اور قیامت کے دن کا' تو وہ گمراہ ہو گیا اور گمراہی میں بہت دُور نکل گیا۔''

یہ تمام آیات بہت اہم ہیں اور مفہوم کے لحاظ سے ان میں بڑی گہرائی ہے۔

آیت ۱۳۷ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا﴾

''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے' پھر کفر کیا' پھر ایمان لائے' پھر کفر کیا' پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے''

یہاں کفر سے مراد کفر حقیقی' کفر معنوی' کفر باطنی یعنی نفاق ہے' قانونی کفر نہیں۔ کیونکہ منافقین کے ہاں کفر و ایمان کے درمیان جو بھی کشمکش اور کھینچا تانی ہو رہی تھی' وہ اندر ہی اندر ہو رہی تھی' لیکن ظاہری طور پر تو ان لوگوں نے اسلام کا انکار نہیں کیا تھا۔

﴿لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ۝﴾ ''تو اللہ نہ ان کی مغفرت کرنے والا ہے اور نہ وہ انہیں راہِ راست دکھائے گا۔''

واضح رہے کہ منافقت کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ ایک ہی دن میں کوئی شخص منافق ہو گیا ہو۔ منافقین میں ایک تو شعوری منافق تھے' جو باقاعدہ ایک فیصلہ کر کے اپنی حکمتِ عملی اختیار کرتے تھے' جیسے ہم سورۂ آل عمران میں ان کی پالیسی کے بارے میں پڑھ آئے ہیں کہ صبح ایمان کا اعلان کریں گے' شام کو پھر کافر ہو جائیں گے' مرتد ہو جائیں گے۔ تو معلوم ہوا کہ ایمان انہیں نصیب ہوا ہی نہیں اور انہیں بھی معلوم تھا کہ وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ دل سے جانتے تھے کہ ہم ایمان لائے ہی نہیں ہیں' ہم تو دھوکہ دے رہے ہیں۔ یہ شعوری منافقت ہے۔

دوسری طرف کچھ لوگ غیر شعوری منافق تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلام قبول تو کیا تھا' ان کے دل میں دھوکہ دینے کی نیت بھی نہیں تھی' لیکن انہیں اصل صورتِ حال کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ پھولوں کی سیج ہے' لیکن ان کی توقعات کے بالکل برعکس وہ نکلا کانٹوں والا بستر۔ اب انہیں قدم قدم پر رکاوٹ محسوس ہو رہی ہے' ارادے میں پختگی نہیں ہے' ایمان میں گہرائی نہیں ہے' لہٰذا ان کا معاملہ ''ہر چہ باداباد'' والا نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کا حال ہم سورۃ البقرۃ کے آغاز (آیت ۲۰) میں پڑھ آئے ہیں کہ کچھ روشنی ہوئی تو ذرا چل پڑے' اندھیرا ہوا تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ کچھ ہمت کی' دو چار قدم چلے' پھر حالات ناموافق دیکھ کر ٹھٹک گئے' رک گئے' پیچھے ہٹ گئے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ لوگ ان کو ملامت کرتے کہ یہ تم کیا کرتے ہو؟ تو اب انہوں نے یہ کیا کہ جھوٹے بہانے بنانے لگے' اور پھر اس سے بھی بڑھ کر جھوٹی قسمیں کھانی شروع کر دیں' کہ خدا کی قسم یہ مجبوری تھی' اس لیے میں رُک گیا تھا' ایسا تو نہیں کہ میں جہاد میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری بیوی مر رہی تھی' اُسے چھوڑ کر میں کیسے جا سکتا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی جھوٹی قسمیں کھانا ایسے منافقین کا آخری درجے کا حربہ ہوتا

ہے۔تو ایمان اور کفر کا یہ معاملہ ان کے ہاں یوں ہی چلتا رہتا ہے' اگرچہ اوپر ایمان باللّسان کا پردہ موجود رہتا ہے۔ جب کوئی شخص ایمان لے آیا اور اُس نے ارتداد کا اعلان بھی نہیں کیا تو قانونی طور پر تو وہ مسلمان ہی رہتا ہے' لیکن جہاں تک ایمان بالقلب کا تعلق ہے تو وہ ''مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ'' کی کیفیت میں ہوتا ہے اور اس کے اندر ہر وقت تذبذب اور اہتزاز (oscillation) کی کیفیت رہتی ہے کہ ابھی ایمان کی طرف آیا' پھر کفر کی طرف گیا' پھر ایمان کی طرف آیا' پھر کفر کی طرف گیا۔اس کی مثال بعینہٖ اُس شخص کی سی ہے جو دریا یا تالاب کے گہرے پانی میں ڈوبتے ہوئے کبھی نیچے جا رہا ہے' پھر ہاتھ پاؤں مارتا ہے تو ایک لمحے کے لیے پھر اوپر آ جاتا ہے مگر اوپر ٹھہر نہیں سکتا اور فوراً نیچے چلا جاتا ہے۔ بالآخر نیچے جا کر اوپر نہیں آتا اور ڈوب جاتا ہے۔ بالکل یہی نقشہ ہے جو اس آیت میں پیش کیا جا رہا ہے۔اگلی آیت میں کھول کر بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ کن لوگوں کا تذکرہ ہے۔

آیت ۱۳۸ ﴿بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ﴾ ''(اے نبیؐ) ان منافقوں کو بشارت دے دیجیے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

یعنی واضح طور پر فرما دیا گیا کہ یہ لوگ منافق ہیں اور ان کو عذاب کی بشارت بھی دے دی گئی۔ یہ عذاب کی بشارت دینا طنزیہ انداز ہے۔

یہاں پر قبولِ حق کے دعویداروں کو یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جو لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے ہیں' اللہ کو اپنا ربّ مانتے ہیں' ان کے لیے یہاں پھولوں کی سیج نہیں ہے' اس لیے جو شخص اس گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ یکسو ہو کر آئے' دل میں تحفظات (reservations) رکھ کر نہ آئے۔ یہاں تو قدم قدم پر آزمائشیں آئیں گی' یہ اللہ کا اٹل فیصلہ ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۵۵)۔ یہاں تو علی الاعلان بتایا جا رہا ہے: ﴿لَتُبْلَوُنَّ فِيْۤ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۫ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًى كَثِيْرًا ؕ﴾ (آل عمران:۱۸۶)۔ یہاں تو مال و جان کا نقصان اٹھانا پڑے گا' ہر قسم کی تلخ و ناز یبا باتیں سننی پڑیں گی' کڑوے گھونٹ بھی حلق سے اُتارنے پڑیں گے' قدم قدم پر خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہا ست بسے شرطِ اوّل قدم ایں است کہ مجنوں باشی!

آیت ۱۳۹ ﴿الَّذِیْنَ یَتَّخِذُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ ''جو اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست بناتے ہیں۔''

ان منافقین کا وطیرہ یہ بھی تھا کہ وہ کفار کے ساتھ بھی دوستی رکھتے تھے اور اپنی عقل سے اس پالیسی پر عمل پیرا تھے کہ: Don't keep all your eggs in one basket ۔ان کا خیال تھا کہ آج اگر ہم سب تعلق' دوستیاں چھوڑ کر' یکسو ہو کر مسلمانوں کے ساتھ ہو گئے تو کل کا کیا پتا؟ کیا معلوم کل حالات بدل جائیں' حالات کا پلڑا کفار کی طرف جھک جائے۔ تو ایسے مشکل وقت میں پھر یہی لوگ کام آئیں گے' اس لیے وہ ان سے دوستیاں رکھتے تھے۔

﴿اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّۃَ﴾ ''کیا وہ ان کے قُرب سے عزت چاہتے ہیں؟''

کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ کیا ان کی محفلوں میں جگہ پا کر وہ معزز بننا چاہتے ہیں؟ جیسے آج امریکہ جانا اور صدرِ امریکہ سے ملنا گویا بہت بڑا اعزاز ہے' جسے پانے کے لیے کروڑوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ چند منٹ کی ایسی ملاقات کے لیے کس کس انداز سے lobbying ہوتی ہے' خواہ اس سے کچھ بھی حاصل نہ ہو اور ان کی پالیسیاں جوں کی توں چلتی رہیں۔

﴿فَاِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا ﴿۱۳۹﴾﴾ ''حالانکہ عزت تو کل کی کُل اللہ کے اختیار میں ہے۔''

لیکن وہ اللہ کو چھوڑ کر کہاں عزت ڈھونڈ رہے ہیں؟

آیت ۱۴۰ ﴿وَقَدْ نَزَّلَ عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ﴾ ''اور یہ بات وہ تم پر نازل کر چکا ہے کتاب میں''

﴿اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا وَیُسْتَھْزَاُ بِھَا﴾ ''کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے''

﴿فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖٓ﴾ ''تو ان کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں''

یہ سورۃ الانعام کی آیت ۶۸ کا حوالہ ہے جس میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ جب تمہارے سامنے کافر لوگ اللہ کی آیات کا استہزاء کر رہے ہوں' قرآن کا مذاق اڑا رہے ہوں تو تم وہاں بیٹھو نہیں' وہاں سے اُٹھ جاؤ۔ یہ مکی آیت ہے۔ چونکہ اُس وقت مسلمانوں میں اتنا زور

نہیں تھا کہ کفار کو ایسی حرکتوں سے زبردستی منع کر سکتے اس لیے ان کو بتایا گیا کہ ایسی محفلوں میں تم لوگ مت بیٹھو۔ اگر کسی محفل میں ایسی کوئی بات ہو جائے تو احتجاجاً وہاں سے اٹھ کر چلے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ایسی باتوں سے تمہاری غیرتِ ایمانی میں بھی کچھ کمی آ جائے یا تمہاری ایمانی حِس کُند پڑ جائے۔ ہاں جب وہ لوگ دوسری باتوں میں مشغول ہو جائیں تو پھر دوبارہ ان کے پاس جانے میں کوئی حرج نہیں۔ دراصل یہاں غیر مسلموں سے تعلق منقطع کرنا مقصود نہیں کیونکہ اُن کو تبلیغ کرنے کے لیے ان کے پاس جانا بھی ضروری ہے۔

﴿اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ﴾ ''ورنہ تم بھی انہی کی مانند ہو جاؤ گے۔''

اگر اس حالت میں تم بھی ان کے ساتھ بیٹھے رہو گے تو پھر تم بھی ان جیسے ہو جاؤ گے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۝۱۴۰﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ جمع کرنے والا ہے منافقوں کو بھی اور کافروں کو بھی جہنم میں سب کے سب۔''

آیت ۱۴۱ ﴿الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ﴾ ''وہ لوگ جو تمہارے لیے انتظار کی حالت میں ہیں۔''

منافق تمہارے معاملہ میں گردشِ زمانہ کے منتظر ہیں۔ دیکھنا چاہتے ہیں کہ حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ یہ لوگ ''تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو'' کی پالیسی اپنائے ہوئے ہیں اور نتیجے کے انتظار میں ہیں کہ آخری فتح کس کی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا طے شدہ منصوبہ ہے کہ دونوں طرف کچھ نہ کچھ تعلقات رکھو، تاکہ وقت جیسا بھی آئے، جو بھی صورت حال ہو، ہم اس کے مطابق اپنے بچاؤ کی کچھ صورت بنا سکیں۔

﴿فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ﴾ ''تو اگر تم لوگوں کو اللہ کی طرف سے کوئی فتح حاصل ہو جائے تو یہ کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟''

اگر اللہ تعالیٰ کی مدد سے مسلمان فتح حاصل کر لیتے ہیں تو وہ آ جائیں گے باتیں بناتے ہوئے کہ ہم بھی تو آپ کے ساتھ تھے، مسلمان تھے، مالِ غنیمت میں سے ہمارا بھی حصہ نکالیے۔

﴿وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ﴾ ''اور اگر کوئی حصہ پہنچ جائے کافروں کو''

کبھی وقتی طور پر کفار کو فتح حاصل ہو جائے، جنگ میں ان کا پلڑا بھاری ہو جائے۔

﴿قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''تو وہ کہیں گے

(اپنے کافر ساتھیوں سے) کیا ہم نے تمہارا گھیراؤ نہیں کر لیا تھا؟ اور ہم نے بچایا نہیں تم کو مسلمانوں سے؟''

یعنی ہم نے تو آپ کو مسلمانوں سے بچانے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا' ہم تو آپ کے لیے آڑ بنے ہوئے تھے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ ہو کر جنگ کرنے آئے تھے؟ نہیں' ہم تو اس لیے آئے تھے کہ وقت آنے پر مسلمانوں کے حملوں سے آپ کو بچا سکیں۔

﴿فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ ''تو اللہ ہی فیصلہ کرے گا تمہارے مابین قیامت کے دن۔''

﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿١٤١﴾﴾ ''اور اللہ اہل ایمان کے مقابلے میں کافروں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔''

جیسا کہ اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سورۃ النساء کا بڑا حصہ منافقین سے خطاب پر مشتمل ہے' اگرچہ اُن سے براہِ راست خطاب میں یٰٓاَیُّهَا الَّذِيْنَ نَافَقُوْا کے الفاظ کہیں استعمال نہیں ہوئے' بلکہ انہیں یٰٓاَیُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ سے ہی مخاطب کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ بھی ایمان کے دعوے دار تھے' ایمان کے مدعی تھے' قانونی طور پر مسلمان تھے۔ یہ ایک طویل مضمون ہے جو آئندہ آیاتِ مبارکہ میں انجام پذیر (conclude) ہو رہا ہے۔

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
☆ اردو اور انگریزی کتابیں
☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

Visit us at www.tanzeem.org

28

اسلام کا نظامِ حیات

اسلامی نظام کی نظریاتی اساس:

ایمان

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۭ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۭ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ (البقرۃ)

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (الشوریٰ)

ادعیہ ماثورہ کے بعد:

معزز حاضرین اور محترم خواتین!

جس سلسلۂ خطبات کا آغاز اس وقت ہو رہا ہے' اس کا اصل موضوع ''اسلام کا نظامِ حیات'' ہے۔ چنانچہ ہمیں اسلام کے نظامِ حیات کے مختلف گوشوں پر قرآن حکیم کی روشنی میں غور و فکر کرنا ہے۔ لیکن ظاہر ہے' ایک خطبے میں ساری تفاصیل بیان نہیں کی جا سکتیں' لہٰذا آج کی نشست میں اس موضوع کے اصول و مبادی کو سمجھیں گے۔ بالفاظِ دیگر آج کے خطبہ میں جو

درحقیقت تمہید کی حیثیت رکھتا ہے' ہم اسلامی نظام کی فکری اساس کا مطالعہ کریں گے۔ اس بارے میں چند ابتدائی باتیں قابل غور ہیں۔

فرد میں فکر و عمل کی مطابقت

فرد کی شخصیت کے دو رُخ ہیں' یعنی اس کا فکر اور عمل۔ ایک نارمل انسان میں یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں' ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فکر صحیح ہو تو عمل صحیح ہوگا اور فکر میں کجی ہو تو اس کا لازمی نتیجہ عمل میں کجی کی صورت میں نکلے گا۔ فکر محدود ہو تو عمل بھی محدود ہوگا' اور فکر میں وسعت کی صورت میں انسان کے اخلاق' معاملات' رویے اور عمل میں بھی وسعت موجود ہوگی۔ فکر و عمل کی عدم مطابقت ایک صحت مند شخصیت میں نہیں ہوسکتی' البتہ مریض شخصیات کا معاملہ جدا ہے۔ اُن کے ہاں ہوسکتا ہے کہ فکر اور عمل کے دھارے مخالف سمت چلتے ہوں۔ مثلاً ایک شخص کو جسمانی عوارض لاحق ہیں۔ اس کے اندر خواہش تو ہے کہ کوئی کام کرے' لیکن جسمانی کمزوری اور معذوری کے باعث وہ اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتا۔ اسی طرح ایک آدمی کو نفسیاتی عوارض لاحق ہوں' جن کی وجہ سے اُس کی قوتِ ارادی مضمحل ہو جائے' تو وہ کچھ کرنا چاہتا بھی ہو پھر بھی کچھ کر نہیں پاتا۔ اس کی بہت ہی سادہ سی مثال ہمارے معاشرے میں سگریٹ نوشی کرنے والے لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں کتنے ہی لوگ ہیں جو تمباکو نوشی چھوڑنا چاہتے ہیں' اس کے مضر اثرات ان کے علم میں ہوتے ہیں' لیکن وہ اپنی عادت کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں اور اس کے چھوڑنے پر قدرت نہیں پاتے۔ تو یہ استثناء ہے۔ البتہ عام اصول یہی ہے کہ ایک نارمل شخص کے فکر و عمل میں مطابقت ہو۔

البتہ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ میں لفظ ''فکر'' استعمال کر رہا ہوں ''قول'' نہیں۔ ایک نارمل انسان میں فکر و عمل کا تضاد نہیں ہوتا۔ قول و فعل کا تضاد اور شے ہے' اور ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے قول اور عمل میں تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کو سخت غصہ دلانے والی شے ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾ (الصف)

''اے ایمان والو! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ اللہ کے ہاں یہ بات سخت بیزاری کی ہے کہ تم وہ کہو جو کرتے نہیں۔''

قول وعمل کا تضاد اس لیے ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ کہہ رہا ہوتا ہے اس پر اس کو ذاتی یقین حاصل نہیں ہوتا۔ وہ جس بات کا دعویٰ اور اعلان کرتا ہے' اُس پر عمل اس لیے نہیں کرتا کہ اس کی حقیقی سوچ وہ نہیں ہوتی۔ قول وعمل کے تضاد کی سب سے بڑی مثال ہم مسلمانوں کا طرزِ عمل ہے۔ ہماری عظیم اکثریت اس وقت جن چیزوں کو ماننے کی مدعی ہے' وہ اکثر و بیشتر لوگوں کے ہاں صرف ایک عقیدہ کی حد تک ہیں اور بندھی پوٹلی کی صورت میں دماغ کے کسی گوشے میں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ عقیدہ ان کے فکر میں پیوست شدہ اور ان کی سوچ میں سرایت کیے ہوئے نہیں ہے۔ بہرحال میں یہاں ''فکر'' کا لفظ استعمال کر رہا ہوں' اور لوگوں کے فکر وعمل میں تضاد صرف استثنائی حالات ہی میں نظر آئے گا' عام حالات میں ایسا نہیں ہوتا۔

جس طرح ایک فرد کا معاملہ ہے اسی طرح کا معاملہ ایک معاشرے' قوم اور کمیونٹی کا بھی ہے۔ ایک قوم اور معاشرہ کا بھی ایک اجتماعی فکر ہوتا ہے۔ اسی اجتماعی فکر سے اس کے نظامِ حیات کی تشکیل ہوتی ہے۔ یعنی اس کا نظامِ اقدار وجود میں آتا ہے' اس کے نظامِ اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے' اس کے نظامِ معاشرت کی صورت گری ہوتی ہے' اُس کا نظامِ معیشت تشکیل پاتا ہے' اُس کا نظامِ سیاست وجود میں آتا ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اجتماعی نظامِ حیات ایک حیاتیاتی اکائی (organic whole) ہے۔ یہ ایک ایسی حیاتیاتی حقیقت ہے جس کے اجزاء کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ نظامِ حیات ایک حیاتیاتی حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ قوم اور معاشرے کی اجتماعی فکر کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ اگر اجتماعی فکر' اجتماعی سوچ اور اجتماعی نقطۂ نظر تبدیل نہ ہو تو معاشرے کے اجتماعی نظامِ حیات میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ (یاد رہے کہ میں لفظ ''فکر'' استعمال کر رہا ہوں' ایک ایسے موروثی عقیدہ کی بات نہیں کر رہا جو محض نسلاً بعد نسلٍ چلا آتا ہے' لیکن قوم کے اجتماعی فکر اور سوچ میں پیوست نہیں ہوتا۔) مثال کے طور پر کیمونزم' ڈیموکریٹک سوشلزم یا سوشل ڈیموکریسی' یہ بھی اجتماعی نظام ہیں جن سے ایک خاص قسم کی معیشت اور ایک خاص طرز کی سیاست وجود میں آتی ہے۔ یہ ایک مخصوص اجتماعی فکر کی پیداوار ہیں۔ ان نظاموں کی فکری اساس جدلی مادیت کا نظریہ ہے' جس نے پوری کائنات اور تاریخ کی ایک مادی توجیہہ کی۔ اس نظریہ یا فکر کے مطابق انسان کے لیے اہم ترین مسئلہ اس کا معاشی مسئلہ ہے' لہٰذا اجتماعی زندگی میں اصل شے وقت کا معاشی نظام ہے' اور معاشی نظام ہی سے اخلاقی اقدار وجود میں آتی ہیں۔ یہ فکر و فلسفہ ایک شخص نے اپنی ایک

کتاب میں پیش کیا۔ اس فکر نے کچھ لوگوں کے ذہنوں پر تسلط قائم کیا۔ پھر انہی لوگوں نے اس فکر کے زیر اثر اشتراکی انقلاب برپا کیا۔ کمیونزم' سوشلزم اور سوشل ڈیموکریسی وغیرہ یہ جدلی مادیت کے شیڈز ہیں۔ ان سب کی فکری اساس اسی پر استوار ہے۔ اسی طرح کا معاملہ اسلام کے نظامِ حیات یا اسلامی نظامِ زندگی کا ہے۔ اس کی بھی ایک فکری اساس ہے۔ اس کے لیے ہمارے ہاں ایک اصطلاح ''ایمان'' ہے۔ لیکن میں یہ اصطلاح استعمال کرنے کی بجائے اس کے لیے ''فکری اساس'' کا لفظ استعمال کر رہا ہوں' تاکہ آپ اس حقیقت پر ذرا وسعتِ نظر سے غور کر سکیں۔

'اسلام کا نظام حیات' کی اصطلاح: حادث بھی اور قدیم بھی

''اسلام کا نظام حیات'' ایک ایسی اصطلاح ہے جو حقیقتاً تو قدیم ہے' لیکن واقعتاً حادث ہے۔ حادث اس معنی میں کہ ہمارے دینی لٹریچر میں اس اصطلاح کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ اصطلاح نہ تو قرآن مجید میں موجود ہے اور نہ احادیث نبویہ کے ذخیرہ میں جو میری نگاہ سے گزرا ہے' یہ اصطلاح مجھے مل سکی ہے۔ میرا گمان ہے کہ ہمارے متقدمین' مفکرین اور ائمہ کے ہاں بھی یہ اصطلاح موجود نہیں ہے۔ بلکہ میرے علم کی حد تک لفظ ''نظام'' بھی پہلی بار شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے استعمال کیا ہے۔ انہوں نے ''فَكُّ كُلِّ نِظَامٍ'' کا انقلابی نعرہ لگایا۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ ''اسلامی نظام حیات'' کی اصطلاح حادث ہے۔ یہ اصطلاح قدیم اس اعتبار سے ہے کہ یہ نوشتۂ دیوار کی مانند ایک روشن حقیقت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب میں جو انقلاب برپا کیا' اور آپؐ جو ہمہ گیر تبدیلی لائے' اس نے زندگی کے تمام گوشوں کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ آپؐ کا برپا کردہ انقلاب صرف عقیدے کی تبدیلی نہ تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اس سے صرف انفرادی زندگی میں تبدیلی آ گئی تھی اور محض انفرادی اخلاق کی تربیت اور تزکیہ کا سامان ہو گیا تھا۔ یہ ساری چیزیں بھی موجود تھیں' لیکن ان کے ساتھ ساتھ یہ انقلاب ایک مکمل نظامِ معیشت' ایک مکمل نظامِ سیاست وحکومت' ایک مکمل قانونِ حدود وتعزیرات' ایک مکمل قانونِ وراثت' ایک مکمل قانونِ فوجداری و دیوانی کا حامل تھا۔ الغرض یہ زندگی کے ہر ہر گوشے کو بدل دینے والا انقلاب تھا۔ یہ کامل نظامِ حیات تھا۔ آپ ﷺ نے اس نظامِ حیات کا عملی نمونہ بھی قائم کر کے دکھا دیا۔ ساری دنیا مانتی ہے کہ یہ نظام تقریباً تیس برس کامل صورت میں دنیا بھر میں قائم رہا۔ اگرچہ بعد میں اس پر زوال آیا' لیکن آنِ واحد میں یہ سارا نظام ختم نہیں ہو گیا' بلکہ اس

کا خاتمہ بھی بتدریج ہوا۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ اسلام کا نظامِ حیات حقیقتاً تو قدیم ہے لیکن جہاں تک ''اسلامی نظامِ حیات'' کی اصطلاح کا تعلق ہے تو یہ ایک حادث اصطلاح ہے۔

میرے نزدیک ''اسلامی نظامِ حیات'' کی اصطلاح کا آغاز بہت ہی مرعوبیت کے ساتھ اور شکست خوردہ ذہنیت کی بنا پر ہوا۔ جب مغرب میں مختلف عمرانی نظریات سامنے آئے' مختلف نظام ہائے حیات کا تصور اُبھرا تو اُن سے مرعوبیت کے سے انداز میں ہمارے ہاں بھی ان نظریات کا ایک عکس اسلامی نظامِ حیات یا اسلامی نظام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مثلاً جب یورپ میں آمریت کا دور دورہ ہوا اور فاشزم اور نازی ازم کا غلغلہ بلند ہوا تو ہمارے ہاں بھی کچھ لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ آمریت ہی صحیح اسلامی نظام ہے۔ پھر جب وہاں جمہوریت کا نعرہ لگا تو ہم نے یہ کہہ دیا کہ ہمارا نظامِ سیاست بالکل جمہوری ہے اور یہی نظام واقعتاً محمد رسول اللہ ﷺ کا عطا کردہ ہے۔ اسی طرح جب وہاں سوشلزم کا شہرہ ہوا تو اسی مرعوبیت کے ساتھ ہم نے کہا کہ سوشلزم عین اسلام ہے اور یہ کہ اسلام سوشلزم کا داعی ہے۔ یہی معاملہ ''نظامِ حیات'' کی اصطلاح کا ہے۔ مغرب میں نظامِ زندگی کا تصور اُبھر کر سامنے آیا اور اس ضمن میں انسان نے مختلف ارتقائی مراحل طے کیے تو ہمارے ہاں بھی ''اسلام کے نظامِ حیات'' کا تصور پیدا ہوا۔

البتہ جیسے جیسے وقت گزرا' ہمارے ہاں ایسے مفکرین پیدا ہوئے جو بحمداللہ مرعوبیت اور شکست خوردہ ذہنیت سے بہت حد تک آزاد تھے۔ انہوں نے مغرب کے عمرانی نظریات کا تنقیدی مطالعہ کیا اور اس میں صحیح اور غلط اجزاء کو علیحدہ علیحدہ کیا۔ پھر ان اجزاء کے حوالے سے اسلام کے نظامِ حیات کو مرتب اور مدوّن کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نظامِ حیات کے حوالے سے مرعوبیت کی کیفیت اب ایک شعور اور خود اعتمادی والی فضا میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس کا ایک اور منطقی تقاضا بھی سامنے آیا۔ اسلامی نظامِ حیات کی طرح لوگوں میں یہ تصور بھی اُبھرا کہ اسلامی نظامِ حیات کو قائم کرنے کے لیے ایک ''اسلامی تحریک'' برپا کرنا ضروری ہے' بالکل اسی طرح جیسے مغرب میں مختلف نظام ہائے حیات کے لیے تحریکیں چلیں' مثلاً جمہوری تحریک' اشتراکی تحریک' نازی تحریک وغیرہ۔

'اسلامی تحریک' کی اصطلاح کا پس منظر

لفظ ''تحریک'' بھی ہمارے ہاں ابتدائی دینی لٹریچر میں موجود نہیں ہے۔ ایک زمانے میں

اس لفظ کا استعمال شروع ہوا تو ہمارے بعض بزرگوں نے اس پر گرفت کی کہ اس لفظ کا استعمال خطرات سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے کہ لفظ ''تحریک'' کے مخصوص مفاہیم ہیں۔ اگر آپ اسلام کو ایک ''تحریک'' قرار دیں گے تو اس سے اُن مفاہیم کو پھیلنے سے نہیں روک سکیں گے جو تحریک کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ سارے مفاہیم اور تصورات بھی اسلام میں شامل ہو جائیں گے۔ اس حوالے سے ایک دور میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ایک وقیع شذرہ بھی تحریر کیا تھا۔

اسلامی تحریک کی اصطلاح دراصل گزشتہ صدی کی تیسری دہائی کے بعد بکثرت استعمال ہونا شروع ہوئی۔ دراصل مسلم لیگ جو پہلے خواص کی جماعت تھی' ۱۹۳۷ کے بعد عوامی تحریک کی صورت میں اُبھری۔ اس دور میں مسلم لیگ نے کانگرس کی تحریک کے مقابلے میں مسلمانوں کو جمع کرنے کے لیے اسلامی حکومت' اسلامی نظام اور اسلامی سیاست جیسی اصطلاحات کو بکثرت استعمال کیا۔ چنانچہ اس سے ان اصطلاحات کا بہت چرچا ہوا اور لوگوں میں اسلامی حکومت قائم کرنے کا ایک جذبہ ابھرا۔ انہیں خیال آیا کہ ہمارا بھی اپنا ایک نظام ہے اور ہمیں اپنے اس نظام کو برپا کرنا چاہیے' اسلامی حکومت قائم ہونی چاہیے۔

۱۹۳۹ء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے علی گڑھ کے سٹریچی ہال میں ایک تقریر کی' جس میں انہوں نے اس دور کے تناظر میں یہ بیان کیا کہ بہت سے سیاسی اور سماجی عوامل کے باعث اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک اسلامی حکومت کے قیام کی شدید خواہش تو پیدا ہو چکی ہے اور اُن میں ایک جوش و جذبہ پایا جاتا ہے' لیکن یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی جا رہی ہے کہ اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے۔ انہوں نے بھرپور تجزیے اور مضبوط دلائل کے ساتھ یہ بات ثابت کی کہ مسلمانوں کی ایک قومی تحریک کے ذریعے اسلامی ریاست کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ اس کے نتیجے میں صرف ایک قومی ریاست ہی وجود میں آ سکتی ہے۔ اُن کا یہ تجزیہ ایک تلخ حقیقت تھی جسے بعد میں تاریخ نے سچ ثابت کر دیا۔ آج پاکستان کے قیام کو ۶۳ برس ہو چکے ہیں۔ (یاد رہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کہ یہ خطاب ۱۹۸۸ء کا ہے) مسلم لیگ کی قومی تحریک کے نتیجے میں پاکستان تو معرضِ وجود میں آ گیا لیکن اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کا خواب تا حال شرمندۂ تعبیر ہے۔ مولانا مودودی نے واضح کیا کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک ''اسلامی تحریک'' ضروری ہے' جس کے کچھ نمایاں خدوخال ہیں۔ انہوں نے اس حوالے سے

خود پیش قدمی بھی کی کہ قومی تحریک کی منجدھار سے ہٹ کر ایک الگ راستہ اپناتے ہوئے جماعتِ اسلامی کے نام سے ایک جماعت کی تاسیس کی۔

اسلامی تحریک کی اساس: شعوری ایمان

مولانا مودودی نے یہ بات تو صحیح فرمائی تھی کہ اسلامی نظام ایک اسلامی تحریک ہی کے نتیجے میں برپا ہوگا' لیکن یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ اس تحریک کے ضمن میں اہم ترین شے اُس کی فکری اساس ہے۔ فکری اساس ہی کے لیے ہم لفظ ''ایمان'' استعمال کرتے ہیں۔ جب تک ایمان ایک شعوری عقیدے کی شکل نہ اختیار کر لے' جب تک وہ ایک personal conviction کی صورت میں نہ ڈھلے اور اس کے اندر یقین کی گہرائی اور گیرائی کی کیفیت نہ پیدا ہو جائے' اس وقت تک ایک حقیقی اسلامی تحریک کا آغاز نہیں ہوگا۔ آپ ایک مسلمان قوم کے موروثی عقائد کی بنیاد پر' جن میں یقین کی حرارت اور گہرائی اور گیرائی نہ ہو' ایک جماعت تو بنالیں گے اور ہوسکتا ہے کہ جماعت کے لوگوں میں وقتی جوش و خروش بھی پیدا ہو جائے' لیکن اس سے اسلامی تحریک برپا نہیں ہوگی۔ ہمارے ہاں کتنی ہی تحریکیں ہیں جو جوش و خروش کا مظاہرہ کر چکی ہیں۔ اس حوالے سے نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی تحریک ایک مثالی تحریک تھی' لیکن اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوا؟ اسلامی تحریک برپا کرنے کے لیے ضروری یہ ہے کہ ہم اس موروثی عقیدے پر انحصار نہ کریں جس کا نام ہم نے ایمان رکھ لیا ہے۔ اس لیے کہ یہ شعوری ایمان نہیں' یہ ہمارا ایک وراثتی عقیدہ ہے جو نسلاً بعد نسلٍ ہم میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ عقیدہ ہماری ذاتی سوچ میں پیوست اور ہمارے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے نہیں ہے۔ اس نے ہمارے ذاتی یقین کی شکل اختیار نہیں کی ہے۔ اس میں Burning faith کی حرارت موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اسلامی تحریک کے لیے فکری اساس کی تعمیرِ نو ناگریز ہے۔ (میں جان بوجھ کر ''ایمان'' کی بجائے ''فکری اساس'' کے الفاظ استعمال کر رہا ہوں۔ اس کے لیے میرے سامنے علامہ اقبال کے خطباتِ مدراس کا عنوان ہے: Reconstruction of Religious Thought in Islam یعنی ''فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو'')

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا اور اس کے لیے آپؐ نے عظیم انقلابی جدوجہد کی۔ اس اعتبار سے اگر آپ نبی کریم ﷺ کی عظیم جدّوجہد کو انقلابی تحریک سے تعبیر کریں تو مجھے اختلاف نہیں ہوگا۔ لیکن یہ بات پیش نظر رہنی

ضروری ہے کہ حضورؐ کی اس جدوجہد میں بھی ایک ترتیب رہی ہے۔ اکبرالٰہ آبادی نے کہا تھا ؎

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

نبی اکرم ﷺ کو صحابہ کرام ؓ کے اندر ایمان کی بنیادوں کو استوار کرنے میں بڑی محنت کرنا پڑی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کا ایمان صرف ایک عقیدہ یا وراثتاً منتقل ہو جانے والے چند عقائد کا مجموعہ نہیں تھا' بلکہ وہ اُن کے رگ و پے میں سرایت کر جانے والی ایک زندہ حقیقت تھی۔ اُن کے لیے ایمانی حقائق محض سنے ہوئے حقائق نہیں تھے بلکہ ایسے یقین کی شکل اختیار کر چکے تھے جس کو حدیث جبرئیل میں ان الفاظ میں تعبیر فرمایا گیا: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ)) ''تم اللہ کی یوں عبادت کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو''۔ یہ حدیث جبریل کا سب سے زیادہ معروف متن ہے اور ان الفاظ کو حضرت عمر فاروق ؓ نے روایت کیا ہے۔ دو اور صحابہ' حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جو روایات مروی ہیں' اُن کے الفاظ میں باریک سا فرق ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے: ((اَنْ تَخْشَى اللّٰهَ تَعَالٰى كَاَنَّكَ تَرَاهُ)) ''تمہیں اللہ سے اس طرح کی خشیت ہونی چاہیے گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو''۔ اور دوسری روایت میں آیا ہے: ((اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ كَاَنَّكَ تَرَاهُ)) ''کہ تو عمل کرے (یا محنت کرے) اللہ کے لیے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔'' ((فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) ''اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو (یہ احساس تو ہو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' کم از کم اس درجے میں تو استحضار موجود رہے۔ چنانچہ اسی کا عکس ہمیں ایک صحابیؓ کے قول میں ملتا ہے۔ ایک روز نبی کریم ﷺ نماز فجر کے بعد حسب معمول مسجد میں بیٹھے تھے۔ آپؐ نے ایک صحابی سے پوچھا: آج تیری صبح کیسے ہوئی؟ انہوں نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول! مجھے ایک خالص اور سچے مومن کی صبح نصیب ہوئی ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے پھر سوال کیا: تمہاری ایمانی کیفیت کی صفت اور علامت کیا ہے؟ صحابیؓ نے عرض کیا: حضور میری کیفیت تو یہ تھی کہ گویا میں اپنی آنکھوں سے جنت کو دیکھ رہا ہوں اور گویا اپنی آنکھوں سے جہنم کو دیکھ رہا ہوں۔ چنانچہ جب تک یقین کی یہ گہرائی پیدا نہیں ہوگی' اسلامی تحریک نہیں چل سکتی۔ اس کے بغیر ایک سیاسی تحریک تو برپا ہو سکتی ہے اور اس میں گہرا مذہبی رنگ اور نمایاں جوش اور ولولہ بھی ہو سکتا ہے' اس میں لوگ قربانیاں بھی دے سکتے اور تن من دھن بھی لگا سکتے ہیں' جیسا کہ ماضی قریب میں مسلمانانِ پاکستان نے

تحریک نظامِ مصطفیٰؐ میں جانیں دی ہیں' لیکن ایک اسلامی تحریک' جو اسلامی نظام کو قائم کر سکے' اس کی بنیادیں اگر ایمان پر نہ اٹھائی گئی ہوں اور اس کی فکری اساس پختہ' محکم اور مستحکم نہ ہو تو وہ کبھی اسلامی نظام کے قیام اور حقیقی اسلامی انقلاب کے برپا ہونے پر منتج نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ لازماً کہیں درمیان میں رہ جائے گی۔ یا تو اس کا جوش خروش ٹھنڈا پڑ جائے گا' یا وہ مشرق یا مغرب کی طرف رخ موڑ لے گی' یا ماحول کے ساتھ مصالحت کر لے گی' یا تحریک کے وابستگان کی ہمت جواب دے جائے گی اور وہ اپنی کم ہمتی کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشیں گے۔

اب میں اسلامی نظام کی فکری اساس کے لیے دوسرا لفظ ''ایمان'' استعمال کر رہا ہوں۔ آیئے' ایمان کی حقیقت کے بارے میں کچھ باتیں سمجھ لیجئے۔

ایمان کا موضوع

پہلی بات یہ ہے کہ ایمان کا موضوع کیا ہے؟ ایمان کا موضوع وہی سوالات اور مسائل ہیں جو فلسفے کا موضوع ہیں۔ یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ انسانوں کی عظیم اکثریت تقلیدی مزاج کے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ وہ جس معاشرے میں آنکھیں کھولتے ہیں' وہاں جو کچھ مانا جا رہا ہوتا ہے' وہ بھی اُسے مان لیتے ہیں اور جو کچھ کیا جا رہا ہو' وہی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ سوسائٹی میں جو بھی عقائد' نظریات اور افکار پہلے سے موجود ہوتے ہیں وہ اُن پر تنقیدی نگاہ ڈالے بغیر انہیں جوں کا توں قبول کر لیتے ہیں اور زندگی کی بھاگ دوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن معاشرے میں ایک بہت ہی معمولی اقلیت ایسے لوگوں کی بھی پائی جاتی ہے جن کے اندر جستجو ہوتی ہے' ایک جذبہ اور ایک پیاس ہوتی ہے۔ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ ہم کسی شے کو صرف اس لیے نہیں مان سکتے کہ بہت سے لوگ اسے مانتے ہیں' بلکہ تب مانیں گے جب ہمارا اپنا فہم' ہماری اپنی میزانِ عقل اُسے قبول کرے گی۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن ''اولوالالباب'' قرار دیتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾﴾

''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

یہی صاحبِ شعور ہیں اور عقل سے کام لینے والے ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں ان کے لیے

''اولوالالباب'' کی جگہ ''قَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ فرمایا:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾

''بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں' رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں' کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا (اور سمندر) میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر رواں ہیں' اور مینہ میں جس کو اللہ آسمان سے برساتا ہے پھر اس سے زمین کو مُردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے' اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں' اور ہواؤں کے چلانے میں' اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں' عقلمندوں کے لیے (خدا کی قدرت کی) نشانیاں ہیں۔''

گویا ''اولوالالباب'' اور ''قَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ'' مترادف الفاظ ہیں۔ اس قسم کے لوگ غور کرتے ہیں' سماج میں پائے جانے والے افکار و نظریات پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا شے قابلِ قبول ہے اور کیا رد کر دینے کے قابل ہے۔

ان لوگوں کے غور و فکر کے اصل مسائل کیا ہیں؟ یہ معلوم کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ علم کے دو گوشے ہیں: ایک تجرباتی علم ہے جو حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے' جبکہ دوسرا حقیقتِ کلی کی تلاش کا علم ہے۔ اسی علم کے مسائل اولوالالباب کے غور و فکر کا میدان ہیں۔ یعنی اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ کیا کائنات کا وجود ہمیشہ سے ہے اور وہ ہمیشہ رہے گی یا وہ حادث ہے؟ اگر حادث ہے تو کیا وہ خود بخود وجود میں آ گئی ہے یا کسی نے اسے بنایا ہے؟ ہماری حقیقت کیا ہے؟ کیا ہم بھی حیوان ہیں' جیسے زمین میں اور حیوانات چل پھر رہے ہیں؟ اگر ہمارے اور حیوانات کے مابین فرق ہے' تو فرق کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ صرف کمیتی فرق ہے' جیسے گھوڑے اور گدھے میں فرق ہے کہ ایک ذرا coarse animal ہے اور ایک refined animal ہے۔ کیا ہم میں اور گوریلے میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ ہم ذرا refined ہو گئے ہیں اور وہ ابھی ارتقاء کی منازل طے کر رہا ہے؟ یا یہ کہ ہمارے اور حیوانوں میں بنیادی فرق نوعیت کا ہے؟ پھر یہ کہ ہمارے محرکاتِ عمل کیا ہیں؟ اور جبلی افعال (instinicts) کون کون سے ہیں؟

اسی طرح آیا خیر و شر کوئی حقیقت ہے؟ یہ محض سراب اور دھوکا ہے؟ (جیسا کہ انگریزی کا ایک بہت گمراہ کن محاورہ ہے: "Nothing is good or bad, only thinking makes so" یعنی کوئی بھی شے نہ اچھی ہے نہ بری' یہ صرف انسان کی سوچ ہے جو اُسے اچھا یا بُرا بنا دیتی ہے۔) یا یہ کوئی حقیقی اقدار ہیں؟ اگر خیر و شر حقیقی اقدار ہیں تو کیا یہ مستقل ہیں یا ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے؟ پھر یہ کہ وہ قوتِ محرکہ (motivative force) کون سی ہے جو انسان کو خیر اختیار کرنے پر مجبور کرے' خواہ بظاہر اس میں نقصان ہو رہا ہو اور شر اور برائی سے منع کرے خواہ بظاہر اس میں فائدہ نظر آتا ہو؟ مثلاً سچ بولنا خیر ہے' لیکن بسا اوقات انسان کو بظاہر نظر آتا ہے کہ سچ بولنے میں خسارہ ہو رہا ہے۔ اسی طرح ایک شخص جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا شر ہے' لیکن کبھی انسان محسوس کرتا ہے کہ جھوٹ بولنے میں نفع ہو رہا ہے۔ فارسی کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

اے دیانت بر تو لعنت از تو رنجے یافتم
اے خیانت بر تو رحمت از تو گنجے یافتم!

(یعنی اے دیانت تجھ پر لعنت ہو' تیری وجہ سے تو لوگ مجھ سے ناراض ہو گئے۔ اور اے خیانت تجھ پر رحمتیں ہوں' تیرے ذریعے مجھے خزانے ملے ہیں۔) اب ان صورتوں میں سچ بولنے اور جھوٹ سے بچنے پر آمادہ کرنے والی قوت کون سی ہے؟ فلسفے کا ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ کیا واقعی' حتمی اور یقینی علم کا حصول انسان کے لیے ممکن ہے یا نہیں؟ اگر یقینی علم کا حصول ممکن ہے تو اس کی ماہیت کیا ہے؟ پھر یہ کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ ہمارا وجود صرف پیدائش سے موت تک ہی محدود ہے یا اس دنیا سے آنے سے پہلے بھی ہمارا وجود تھا اور یہ زندگی ہمارے اُسی وجود کا تسلسل ہے؟ اور اگر موت کے بعد بھی یہ وجود رہے گا تو اس کی کیا کیفیت ہو گی؟

اولوالالباب کی تلاش و جستجو

ان تمام مسائل اور سوالوں پر اصحابِ عقل سوچ بچار کرتے ہیں' اگرچہ ایسے لوگ انسانی معاشروں میں خوردبینی اقلیت (microscopic minority) ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے اس قسم کے سوالوں کی تلاش میں عمریں کھپا دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو دنیا کی کسی شے سے دلچسپی نہیں رہتی' جب تک کہ وہ ان سوالات کا کوئی تسلی بخش جواب حاصل نہ کر سکیں۔ گہرے غور و فکر اور تلاش و جستجو کے بعد انہیں جو جواب ملتا ہے وہ انہیں اتنا عزیز ہوتا ہے کہ اس کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی زندگیوں

میں خواہ ان کی باتوں کو رد کیا گیا ہو' چاہے انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہو' چاہے ان کو جاہل' پاگل اور مجنون کہا گیا ہو' لیکن ان کے مرنے کے بعد عامۃ الناس اُن کے نظریے کو قبول کر لیتے ہیں اور کروڑوں لوگ ان کے پیروکار بن جاتے ہیں۔

گوتم بدھ کی مثال لے لیجیے۔ ان کے پاس کیا کچھ نہیں تھا؟ بیوی موجود تھی' شیر خوار بچہ تھا' عالیشان گھر تھا' شان و شوکت تھی۔ الغرض زندگی میں جتنی بھی چیزوں سے انسان کو دلچسپی ہو سکتی ہے وہ ساری کی ساری چیزیں اُن کے پاس موجود تھیں۔ لیکن اُن کے ذہن میں کچھ سوالات پیدا ہوئے' مثلاً دنیا میں دکھ کیوں پائے جاتے ہیں؟ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایک شخص ٹھوکر کھا کر گرتا ہے اور اُس کا سر پھٹ جاتا ہے؟ اسی طرح ایک شیر خوار بچہ والدین کی نگاہوں کے سامنے دم توڑ رہا ہوتا ہے اور والدین بے بسی کی تصویر بنے کچھ نہیں کر سکتے اور اُن پر صدمے کا پہاڑ ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر یہ کہ انسان کے لیے ان دکھوں سے نجات کا کوئی راستہ ہے بھی یا نہیں؟ اس قسم کے سوالوں نے گوتم بدھ کو کرب میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ جوان بیوی، شیر خوار بچہ اور گھر بار چھوڑ کر تلاشِ حقیقت کے لیے جگہ جگہ پھرتے رہے' کبھی ایک رشی کے پاس پہنچے تو کبھی دوسرے کے پاس۔ اس تلاش و جستجو کے نتیجے میں انہوں نے جو کچھ پایا' اس سے قطع نظر کہ وہ کتنا صحیح ہے' یہ حقیقت ہے کہ آج کروڑوں لوگ اُن کے نام لیوا اور پیروکار ہیں۔ دوسری مثال سقراط کی ہے۔ سقراط نے غور و فکر سے کچھ نتائج اخذ کیے اور پھر انہیں عام کرنا شروع کیا۔ چونکہ اُس کے افکار معاشرے کی فکر سے مختلف تھے' لہٰذا قوم نے اس کے سامنے دو اختیار (options) رکھے' یا تو خاموش رہو' اپنے نظریات کی تبلیغ نہ کرو' یا پھر زہر کا پیالہ پی کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لو۔ سقراط نے اسی مجلس میں زہر کا پیالہ پی لیا' مگر اپنے نظریات کی تبلیغ سے باز رہنا گوارا نہ کیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غور و فکر کے نتیجے میں انسان کو جو کچھ ملتا ہے اس کی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں کیا ہوتی ہے۔ سقراط کی زندگی میں تو اُس کے ساتھ یہ سلوک ہوا' لیکن بعد میں اس کے فلسفے کو پذیرائی ملی۔ آج پوری دنیا میں مغربی فلسفے کی جو دو شاخیں چلی آتی ہیں یعنی حقیقت پسندی (Realism) اور تصوریت (Idealism) اُن کے امام کی حیثیت سقراط کو حاصل ہے۔

تیسری مثال حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی ہے۔ وہ ایران میں پیدا ہوئے' جہاں کے لوگ آتش پرستی میں مبتلا تھے۔ اُن کی طبیعت کو یہ چیز گوارا نہ ہوئی۔ انہوں نے سوچا عجیب بات

ہے کہ ہم خود آگ جلائیں اور خود ہی اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں۔ تلاشِ حقیقت کی جستجو نے انہیں مضطرب کر دیا۔ چنانچہ اپنا گھر بار اور اپنا ملک چھوڑ کر شام پہنچے۔ وہاں کچھ عیسائی راہبوں کی خدمت میں رہے۔ اس سے اُن کے علم کی پیاس کو کچھ تسکین حاصل ہوئی۔ اس کے بعد آپؓ ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے شخص کے پاس گئے۔ جس طرح گوتم بدھ ہندوستان کے رِشی مَونی (جوگیوں کا خاموش رہنے والا گروہ) میں سے کبھی ایک کے پاس اور کبھی دوسرے کے پاس گئے' ایسے ہی سلمان فارسی کئی لوگوں کے پاس گئے۔ آخری عالم شخص جس کے پاس آپؓ گئے تھے' جب اس کے انتقال کا وقت آیا تو آپؓ نے اس سے کہا کہ آپ کا آخری وقت آ گیا' لیکن ابھی میری پیاس نہیں بجھی' اب مجھے بتایئے کہ آپ کے بعد میں کہاں جاؤں؟ اس عالم نے کہا کہ میری نظر میں اس وقت کوئی ایسا عالم نہیں جو صحیح راستہ پر ہو اور میں تم کو اس کا پتا بتا سکوں۔ البتہ ایک نبی کے ظہور کا وقت قریب آ گیا ہے جو دینِ ابراہیمی پر ہوگا۔ عرب کی سرزمین پر اُس کا ظہور ہوگا اور ایک نخلستانی زمین کی طرف وہ ہجرت کریں گے۔ اگر تمہارا وہاں پہنچنا ممکن ہو تو ضرور پہنچنا۔ اُن کی علامت یہ ہوگی کہ صدقہ کا مال نہ کھائیں گے' ہدیہ قبول کریں گے۔ ان کے دونوں شانوں کے قریب مہرِ نبوت ہوگی۔ جاؤ قسمت آزمائی کرو' شاید اللہ تمہیں ان کے قدموں تک پہنچا دے۔ چنانچہ آپؓ ایک قافلے کے ساتھ عرب کی طرف چل نکلے۔ راستے میں قافلے پر ڈاکہ پڑا تو انہیں غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا۔ آپؓ کو خریدنے والا مدینے کا ایک یہودی تھا' چنانچہ آپؓ مدینہ پہنچ گئے' لیکن چونکہ آپؓ کی حیثیت غلام کی تھی' لہٰذا اس کے باوجود کہ آپ یہ سن رہے تھے کہ مکہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے' مگر پابند ہونے کی بنا پر وہاں جا نہیں سکتے تھے۔ میں یہ کہا کرتا ہوں حضرت سلمانؓ کے حوالے سے شاید یہ بات غلط نہ ہو' کہ ان کی حقیقت یا طلبِ ہدایت کی پیاس کا ثمرہ ہے کہ عام محاورے کے برعکس کنواں پیاسے کے پاس چل کر پہنچا۔ یعنی رسولِ خدا حضرت محمد ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے اور حضرت سلمان فارسیؓ کی آپؐ تک رسائی ہوئی اور آپؐ کی خدمت میں طویل عرصہ رہے۔

انبیاء کرامؑ نے بھی غور و فکر کے مراحل طے کیے

میں نے مشرق' مغرب اور مڈل ایسٹ سے تین مثالیں دیں' اب میں آپ کو تصویر کا دوسرا رُخ دکھا دینا چاہتا ہوں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے حوالے سے بھی یہ بات اپنی جگہ پر حقیقت

ہے کہ انہوں نے بھی غور وفکر کے مراحل طے کیے۔ سورۃ الشوریٰ (آیت ۵۲) میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا:

﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾

''اے نبی آپ کو معلوم نہیں تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے' لیکن ہم نے اس (قرآن) کو نور بنایا ہے' اس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔''

اگرچہ مفسرین نے اس ایمان کے ضمن میں یہی کچھ کہا ہے کہ اس سے مراد تفصیلی ایمان ہے' کیونکہ اجمالاً ایمان تو ہر نبی کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ میں اس کی تعبیر یوں کرتا ہوں کہ نبی کے دل میں بالقوۃ ایمان موجود ہوتا ہے' ہاں اس کا بالفعل ظہور آغازِ وحی کے ساتھ ہوتا ہے۔ درحقیقت جو بات یہاں کہی گئی ہے اسی کی طرف اشارہ سورۃ الضحیٰ میں ہے۔ وہاں فرمایا: ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ یعنی ''(اے نبی) آپ کو اللہ نے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں (حقیقت کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے) پایا تو راہ دکھائی۔'' بہرحال یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ انبیاء کرام غور وفکر کے دور سے نہیں گزرے۔ سوچ بچار کا دور اُن پر بھی آتا رہا اور وہ بھی ان تمام مراحل سے گزارے گئے۔ یہاں تک کہ جب وہ عقل وفطرت کے راستے پر چلتے اور غور وفکر کی منازل طے کرتے ہوئے حقیقت کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے اور دستک دی تب اُن پر دروازہ کھلا۔

حضور ﷺ کے بارے میں تو صراحت موجود ہے کہ آپ غارِ حرا میں غور وفکر کیا کرتے تھے۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سب سے پہلی وحی جو رسول اللہ ﷺ پر اُترنی شروع ہوئی وہ سچے خواب تھے' جو آپ بحالت نیند دیکھتے تھے' چنانچہ جب بھی آپ خواب دیکھتے تو وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہو جاتا۔ پھر آپ کو تنہائی سے محبت ہونے لگی اور آپ غارِ حرا میں کئی کئی روز تک تنہا رہنے لگے۔ وہاں آپ تحنث کیا کرتے۔ شارحینِ حدیث نے اس کے لیے الفاظ استعمال کیے ہیں: كَانَ صِفة تعبّدِهٖ فی غارِ حراءِ التفكر والا عتبار ''غارِ حرا میں آپ کی عبادت کی کیفیت یہ تھی کہ آپ غور وفکر اور سوچ بچار کیا کرتے تھے''۔ معلوم ہوا کہ غور وفکر کے مراحل سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی گزرے ہیں۔ وحی کے

ذریعے ایمان کی گہرائی اور اس کے خاکے میں تفصیلات کا رنگ بھرا گیا۔

یہی معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔ ان کے غور و فکر کے مراحل کا بیان سورۃ الانعام کی آیات ۷۵ تا ۷۹ میں آیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۗلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾

''اور ہم اس طرح ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھانے لگے' تاکہ وہ خوب یقین کرنے والوں میں ہو جائیں۔ (یعنی) جب رات نے ان کو (پردۂ تاریکی سے) ڈھانپ لیا تو (آسمان میں) ایک ستارے پر نظر پڑی' کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے۔ پھر جب وہ غائب ہو گیا تو کہنے لگے کہ مجھے غائب ہو جانے والے پسند نہیں۔ پھر جب چاند کو دیکھا کہ چمک رہا ہے' کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے۔ لیکن جب وہ چھپ گیا تو بول اٹھے کہ اگر میرا پروردگار مجھے سیدھا راستہ نہیں دکھائے گا تو میں ان لوگوں میں ہو جاؤں گا جو بھٹک رہے ہیں۔ پھر جب سورج کو دیکھا کہ جگمگا رہا ہے تو کہنے لگے میرا پروردگار یہ ہے' یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہنے لگے: لوگو جن چیزوں کو تم (اللہ کے) شریک بناتے ہو' میں ان سے بے زار ہوں۔ میں نے سب سے یکسو ہو کر اپنے آپ کو اسی ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''

اگرچہ ان آیات کی ایک تعبیر اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مظاہرِ فطرت سے مکالمہ اپنی قوم پر اتمامِ حجت کے لیے تھا۔ لیکن بعض مفسرین کی رائے یہ بھی ہے کہ یہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فکر کے ارتقاء کے مراحل ہیں' جن کا ذکر یہاں ہوا ہے۔

انبیاء کرام کی دعوت اور فلاسفہ کے نظریات کا اصل فرق

تلاشِ حقیقت سے متعلقہ سوالوں کے جوابات کے حوالے سے ہمیں انسانی تاریخ میں دو گروہ ملتے ہیں۔ ایک وہ لوگ جن کو ہم فلسفی اور حکماء کہتے ہیں' جنہوں نے اپنے غور وفکر' سوچ بچار' اپنی منطق اور عقل کے گھوڑے دوڑا کر حقیقت کی پردہ کشائی کی کوشش کی ہے۔ اس غور وفکر کے نتیجے میں انہیں جو محسوس ہوا' اُسے انہوں نے مرتب کیا۔ اُن کے ان افکار کو ہم فلسفہ کہتے ہیں کہ فلاں حکیم کا یہ فلسفہ ہے' فلاں فلسفی کا یہ نظامِ فکر ہے۔ فلسفی اور حکماء کے جوابات کا واحد ذریعہ غور وفکر ہے۔ انہوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اُن کے پاس غور وفکر کے علاوہ کوئی اور ذریعہ بھی ہے جس سے انہیں یہ حقائق معلوم ہوئے۔ انہوں نے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا کہ یہ فکر جو ہم پیش کر رہے ہیں' ہمارے اپنے غور وفکر اور سوچ کا نتیجہ ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ آج تک کسی فلسفی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ غور وفکر سے جو نتائج اُس نے اخذ کیے ہیں وہ صد فی صد حق ہیں۔ خود علامہ اقبال نے اپنے خطبات کے دیباچے میں یہ الفاظ لکھ دیے ہیں کہ میں ہرگز دعویٰ نہیں کرتا کہ جو کچھ میں نے ان خطبات میں کہا ہے وہ حرفِ آخر ہے' بلکہ ہمارا کام یہ ہے کہ طالب علمانہ انداز میں غور وفکر جاری رکھیں۔ ہوسکتا ہے جیسے جیسے وقت گزرے اس سے صحیح تر باتیں سامنے آجائیں۔

دوسرا گروہ انبیائے کرام علیہم السلام کا ہے۔ فلاسفہ کے مقابلے میں انبیاء کرامؑ جو دعوت پیش کرتے رہے' اُس کے بارے میں انہوں نے یہ نہیں کہا کہ جو کچھ ہم پیش کر رہے ہیں وہ ہماری سوچ اور ہمارے غور وفکر کا نتیجہ ہے' بلکہ وہ دوٹوک انداز میں یہ کہا کہ اس کا ذریعہ وحی ربانی ہے' وحی کے ذریعے ہمیں ان حقائق تک رسائی ہوئی ہے۔ پھر یہ کہ انہوں نے صاف اعلان کیا کہ یہ دعوت صد فی صد حق ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے آغاز ہی میں لوگوں پر واضح کر دیا گیا کہ ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ (البقرۃ:۲) ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں (یہ کُل کا کُل حق ہے)۔'' اسی طرح سورۂ مریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل ہوا ہے۔ وہ اپنے والد سے کہتے ہیں' ابا جان آپ کو میری پیروی کرنی ہوگی۔

﴿يٰٓاَبَتِ اِنِّىْ قَدْ جَآءَنِىْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِىْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا﴾ (مریم)

''ابا جان' میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا' پس میری پیروی کریں

میں آپ کی سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کروں گا۔''

بظاہر یہ بات غیر منطقی اور غیر معقول دکھائی دیتی ہے کہ بیٹا باپ سے پیروی کا تقاضا کرے۔ اس لیے کہ دنیا میں باپ زندگی کے مختلف مراحل سے گزرا ہوا ہوتا ہے' اس کا تجربہ زیادہ ہوتا ہے اور بیٹے کا تجربہ کم ہوتا ہے۔ لہٰذا بیٹے کا باپ سے اپنی پیروی کا مطالبہ کرنا بظاہر عجیب لگتا ہے' لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام علم وحی کی بنیاد پر والد سے پیروی کا مطالبہ کر رہے تھے' اور وہ انہی کے پاس تھا' باپ کو حاصل نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام جو دعوت پیش کرتے ہیں وہ وحی کی بنیاد پر کرتے ہیں اور پھر اس دعوے کے ساتھ کرتے ہیں کہ یہ حق ہے۔ اصطلاحاً ان کی دعوت کو برحق ماننے کا نام ایمان ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام عقل وفطرت کے منافی بات منوانا چاہتا ہے اور ایمانی حقائق کے پیچھے کوئی عقلی اور منطقی بنیاد نہیں ہے۔ بلکہ وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ تو تمہاری فطرت کی آواز ہے' یہ تمام حقائق تمہارے اندر موجود ہیں' لیکن خوابیدہ (dormant) ہیں' وحی نے آ کر صرف ان کو جگایا ہے' وحی کے ذریعے ان میں یقین کی گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی ہے۔

اسلام کا تصورِ کائنات وانسان

اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ کیا حقائق ہیں جن کا انکشاف وحی کے ذریعے انبیاء کرامؑ پر ہوا ہے۔ ان حقائق کو اگر ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ دراصل اسلام کا تصورِ کائنات وانسان ہے' اسلامی نظامِ حیات کی نظریاتی اساس ہے' ایک فکر وفلسفہ ہے۔ اسلامی نظامِ حیات بالفعل وجود میں آنے کا احساس تب ہی ہوگا جب یہ فکری اساس تعمیر ہوگی۔ اگر یہ اساس ہی تعمیر نہیں ہوتی تو اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ اسلام کا نظامِ حیات اپنی حقیقی صورت میں دنیا میں دوبارہ قائم ہو سکے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ ان حقائق کے ضمن میں جو چیزیں مَیں آپ کے سامنے بیان کروں گا' وہ اگرچہ سب کے سب قرآن مجید کے حقائق ہیں' تاہم ان میں سے بعض حقائق کو قرآن نے جلی انداز میں بیان کیا ہے اور بعض حقائق قرآن میں اشارات کی شکل میں آئے ہیں۔ ان میں جو صریح وجلی حقائق ہیں انہی کے مجموعے کا نام ایمان ہے۔ ان حقائق کی ضرورت ہر عام وخاص کو ہے۔ ایک ذہین شخص بھی اس کی احتیاج رکھتا ہے اور ایک عام انسان بھی۔ لہٰذا یہ حقائق جو ایمان کے بنیادی اجزاء ہیں' عام انسانی فہم کے قریب تر ہیں اور ان کو تکرار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ البتہ یہ حقیقت

ہے کہ اسلام کا تصورِ کائنات وانسان پوری طرح تب ہی واضح ہوگا جب ان صریح اور جلی حقائق کے ساتھ مخفی حقائق کو بھی جمع کر لیا جائے۔ پس ان جلی اور خفی حقائق کو ایک ترتیب کے ساتھ آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں۔

کائنات اور خالقِ کائنات کا تعلق

پہلی بات یہ ہے کہ یہ کل کائنات' یہ سلسلۂ کون و مکان' یہ سلسلۂ موجودات جو تا حدِ نگاہ ہمارے سامنے ہے' حادث اور فانی ہے۔ یہ ہمیشہ سے نہیں ہے اور نہ ہی ہمیشہ رہے گا۔ ایک اللہ ہی کی ہستی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور اس ہستی کے ساتھ کائنات کی نسبت خالق اور مخلوق کی ہے۔ اللہ نے اسے بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ صرف اس کا خالق ہے بلکہ وہی اس کی صورت گری کرنے والا اور وہی منتظم ہے۔

اللہ کی یہ تخلیق بالحق اور بامقصد ہے۔ یہ کوئی رام کی لیلا نہیں ہے' نہ دیوتاؤں کی تماشگاہ یا تھیٹر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ اگر ہمارا ارادہ ہوتا کہ کوئی تماشا کریں تو ہم اپنے پاس سے کوئی بندوبست کر لیتے۔ سورۃ الانبیاء میں دوٹوک انداز میں فرما دیا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ﴾ ''ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو ان کے درمیان ہے' کھیل تماشے کے لیے نہیں بنایا''۔ اسی طرح سورۂ آل عمران میں فرمایا: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ ''اے ہمارے رب تو نے یہ (کارخانۂ قدرت) بے مقصد نہیں پیدا کیا۔ تو پاک ہے' پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا''۔

یہ کائنات ایک خاص وقت تک کے لیے ہے' جب اس کا وقت پورا ہو جائے گا تو فنا ہو جائے گی' جبکہ اللہ کی ہستی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اللہ کا کوئی مدمقابل' کوئی ہم سر اور ہم پلہ نہیں۔ انسان خیر و بھلائی اور اعلیٰ سے اعلیٰ خوبی کا جو تصور کر سکتا ہے وہ اللہ کی ذات میں بتمام و کمال موجود ہے۔ مثلاً قدرت ایک قدر ہے' تو اللہ تعالیٰ ''عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ'' ہے۔ علم ایک اعلیٰ قدر ہے تو اللہ ''بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ'' ہے۔ زندگی ایک اعلیٰ شے ہے' تو وہ ''اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ'' ہے' اور اس کی حیات اتنی مکمل ہے کہ ''لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ''۔ (نہ تو اسے نیند آتی ہے اور نہ اُونگھ)۔

کائنات اور خالقِ کائنات کے تعلق سے ان حقائق کو تسلیم کرنے کا نام ایمان باللہ ہے' اور یہی ایمان سارے ایمانیات کی اصل اساس اور جڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایمانِ مجمل کا ذکر

آتا ہے تو اس میں سوائے ایمان باللہ کے اور کسی شے کا ذکر نہیں ہوتا' صرف اللہ اور اُس کی صفات کا ذکر ہوتا ہے۔ ایمانِ مجمل میں ہم میں سے ہر شخص یہ اقرار و تصدیق کرتا ہے کہ:

((آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَ صِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ))

''میں ایمان لایا اللہ پر جیسے کہ وہ ظاہر ہے اپنے اسماء وصفات سے۔ اور میں نے اُس کے تمام احکام قبول کیے۔ میں اس کا زبانی اقرار کر رہا ہوں اور اس پر دل سے یقین رکھتا ہوں۔''

اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان ایک حقیقتِ کُلی بن کر آپ کے دل میں جاگزیں ہو گیا ہے' اللہ کی ہستی' اُس کے حاضر و ناظر ہونے' اُس کے ''عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر'' اور ''بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْم'' ہونے اور اُس کے ہمیشہ ساتھ ہونے کا یقین اگر دل میں موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان باللہ حقیقتاً موجود ہے۔ اور اگر یہ یقین نہیں تو پھر یہ محض ایک عقیدہ ہے' ایک dogma ہے' ایک موروثی خیال ہے' جو آپ کو وراثتاً منتقل ہو گیا ہے۔

انسان کی تخلیق کے دو مراحل

دوسری بات یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق کا نقطۂ کمال انسان ہے۔ یوں تو یہ آسمان' زمین' ستارے' سیارے' فضائیں' پہاڑ سب اللہ کی تخلیق ہیں' اور یہ مخلوقات اس کی نشانیاں اور اس کی عظمت کے مظاہر ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے تین وجود ایسے پیدا کیے ہیں جو مکلف ہیں۔ ایک فرشتے ہیں جو نوری الاصل ہیں' دوسرے جنات ہیں جن کا مادۂ تخلیق آگ ہے' اور تیسری مخلوق انسان ہے جو سلسلۂ ارضی کی مخلوقات (نباتاتی و حیواناتی سلسلۂ حیات) کی چوٹی پر فائز ہے۔ انسان کے شرف و امتیاز اور بلند مقام کا سبب کیا ہے؟ درحقیقت انسان کا وجود دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک اس کا جسدِ حیوانی یا جسدِ مادی ہے جو خاکی الاصل ہے۔ یہ اسی زمین سے بنا ہے۔ نظریۂ ارتقاء سے قطع نظر' قرآن اور سائنس دونوں اس نکتہ پر متفق ہیں کہ انسان کی ابتدا قشرِ ارض (crust of the earth) سے ہوئی ہے۔ دوسرا انسان کا روحانی وجود ہے جو خاکی الاصل نہیں ہے' بلکہ نوری الاصل ہے اور فرشتوں سے بھی بلند تر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ آدم کے وقت فرشتوں سے فرمایا: ﴿فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ﴾ (صٓ)

''پھر جب میں اس کی نوک پلک سنوار لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں' تو اس

کے سامنے سجدے میں گر پڑنا''۔ معلوم ہوا کہ انسان اور حیوانات میں فرق صرف کمیت کا نہیں بلکہ اصل فرق نوعیت کا ہے۔ حیوانات صرف اس خاکی اور زمینی وجود پر مشتمل ہیں اور ان کا کل وجود یہی ہے' جبکہ انسان جسدِ حیوانی کے ساتھ روحانی وجود بھی رکھتا ہے۔ شیخ سعدیؒ کہتے ہیں ؎

آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ وز حیوان

یعنی یہ آدمی زادہ عجیب مرکب اور معجون ہے۔ اس میں فرشتہ بھی ہے اور حیوان بھی ہے۔ فرشتہ اس معنی میں کہ جس طرح فرشتے نوری الاصل ہیں ہماری ارواح بھی نوری الاصل ہیں' اور حیوان اس اعتبار سے کہ جانوروں کی طرح ہمارا وجودِ حیوانی بھی اسی خاک سے بنا ہے۔ انسان میں یہ دونوں چیزیں آ کر جمع ہو گئی ہیں۔ یہی اس کے شرف و امتیاز کا سبب ہے اور اسی بنا پر اس کو خلافت سے سرفراز فرمایا گیا۔ سورۂ ص میں فرمایا گیا: ﴿خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ ''میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا''۔

انسان کی تخلیق میں عالمِ امر اور عالمِ خلق دونوں جمع ہو گئے۔ اسی لیے صوفیائے کرام انسان کو ''عالمِ اصغر'' کہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر انسان کی تخلیق دو مراحل میں ہوئی۔ پہلا مرحلہ وہ ہے جس میں ارواحِ انسانیہ کو پیدا کیا گیا اور یہ ارواح ''جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ'' کی شکل میں تھیں۔ اُن میں باپ بیٹے اور پوتے پڑپوتے کی کوئی نسبت نہیں تھی۔ یہ تمام ارواح بیک وقت وجود میں آئیں۔ اسی عالمِ امر میں اللہ تعالیٰ نے تمام ارواحِ انسانیہ سے اپنی بندگی کا عہد لیا۔ اللہ نے پوچھا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ''کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں'' ﴿قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا﴾ ''سب نے کہا' کیوں نہیں ہم گواہی دیتے ہیں (کہ اے اللہ تو ہی ہمارا رب ہے)۔'' انسان کی تخلیق کا دوسرا مرحلہ عالمِ خلق میں اس کے جسدِ حیوانی کی تخلیق ہے۔ اس مرحلے میں تمام انسان یکبارگی پیدا نہیں کیے گئے' بلکہ اُن کی پیدائش میں زمانی فصل چلا آ رہا ہے۔ ہمارے جدِّ امجد حضرت آدم علیہ السلام شاید آج سے دس ہزار سال پہلے دنیا میں آ گئے تھے۔ اس کے بعد اب تک اربوں انسان پیدا ہوئے اور مر گئے۔ آج ہم اس دنیا میں ہیں' کل کوئی اور ہو گا۔ انسان کی تخلیقِ اوّل کے بارے میں اشارہ اس آیت میں ملتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ روزِ محشر اپنے دربار میں کھڑے تمام لوگوں سے یہ فرمائے گا: ﴿لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ ۡ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا﴿۴۸﴾﴾ (الکہف) ''جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا (اسی طرح

آج) تم ہمارے سامنے آئے ہو۔ لیکن تم نے تو یہ خیال کر رکھا تھا کہ ہم نے تمہارے لیے (قیامت کا) کوئی وقت مقرر ہی نہیں کیا''۔ پہلی تخلیق کے مرحلے پر اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو بیک وقت پیدا کیا اور میدان حشر میں بھی اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو اپنے سامنے حاضر کر دے گا۔ بہر حال یہ چیزیں وہ ہیں جو مخفی حقائق ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے ضمن میں صرف اشارات آئے ہیں۔

انسانی زندگی کی حقیقت

تیسری چیز جو قرآن مجید کے ہر صفحے پر نمایاں کی گئی ہے' وہ انسانی زندگی کی حقیقت سے متعلق ہے۔ وہ لوگ جو صرف حواس کے دائرے تک اپنے آپ کو محدود رکھیں وہ تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ پیدائش سے پہلے بھی ہمارا کوئی وجود تھا اور نہ یہ مان سکتے ہیں کہ موت کے بعد بھی ہمارے وجود کا تسلسل برقرار رہے گا۔ ان لوگوں کے نزدیک لامحالہ زندگی پیدائش اور موت کا درمیانی وقفہ قرار پائے گی۔ یہی چالیس' پچاس' ساٹھ سالہ عرصہ کل زندگی شمار ہوگا۔ اسی زندگی کے متعلق بہادر شاہ ظفر نے کہا ہے: ؎

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف پیدائش سے موت تک کے وقفے کا نام نہیں ہے۔ بقولِ اقبال: ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی

انسان جو تخلیق کا نقطۂ عروج ہے' اس کی کل زندگی یہی نہیں ہے' بلکہ اس کی زندگی بہت طویل ہے۔ موت معدوم ہو جانے کا نام نہیں' بلکہ ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہونے کی کیفیت ہے۔ گویا: ؎

موت اِک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

موت تو زندگی کا تسلسل ہے۔ انسان کی آنکھ یہاں بند ہوتی ہے تو کسی اور عالم میں کھل جاتی ہے ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے!

دُنیوی زندگی انسان کی طویل زندگی کا ایک مختصر سا حصہ ہے۔ موت کا وقفہ ڈال کر درحقیقت زندگی کے اس چھوٹے سے حصے کو علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ یہ وقفہ کیوں ڈالا گیا ہے' اس کا جواب انبیاء کرام علیہم السلام نے دیا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ انسان کی آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ یہ زندگی ایک امتحان اور ایک ٹیسٹ ہے۔ قرآن عزیز کہتا ہے:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملک:۲)

''اُس (اللہ) نے موت اور زندگی (کے سلسلہ) کو اس لیے پیدا کیا تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں کون اچھے اعمال کرتا ہے۔''

اسی مضمون کو علامہ اقبال نے شعری پیرایہ میں یوں بیان کیا ہے:۔

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اس امتحان کا نتیجہ موت کے بعد نکلے گا' جب انسان کو دوبارہ اُٹھایا جائے گا اور اس کا حساب کتاب ہوگا۔ اس امتحانی وقفے میں اُس نے جو کمایا' جو کھایا' جو زبان سے کہا' جو آنکھ سے دیکھا' ہر شے کا پورا پورا حساب ہوگا۔ انسان کا ہر ایک چھوٹا بڑا عمل اُس کے سامنے آجائے گا۔ کوئی بہت بڑا (giant) کمپیوٹر ہوگا کہ ایک بٹن دبے گا اور آپ کی پوری زندگی کی ریل آپ کے سامنے آجائے گی' جسے دیکھ کر مجرمین حیران و سرگرداں ہو جائیں گے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَوُضِعَ الْکِتٰبُ فَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا فِیْهِ وَیَقُوْلُوْنَ یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّلَا کَبِیْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا یَظْلِمُ رَبُّکَ اَحَدًا﴾ (الکہف)

''اور عملوں کی کتاب کھول کر رکھی جائے گی' تو تم گناہ گاروں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں (لکھا) ہوگا اس سے ڈر رہے ہوں گے' اور کہیں گے ہائے ہماری شامت' یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے۔ اور جو عمل انہوں نے کیے ہوں گے سب کو حاضر پائیں گے۔ اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔''

اور کہا جائے گا:

﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾﴾ (بنی اسراء یل)

''اپنی کتاب پڑھ لے۔ تو آج اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔''

کوئی بھی اپنے اس اعمال نامے کو جھٹلا نہ سکے گا۔ اس حساب کتاب کے نتیجے پر ہی انسان کی ابدی زندگی کی کامیابی یا ناکامی کا دارو مدار ہے۔ یا تو انسان کو دائمی جنت ملے گی یا پھر اُسے آتشِ جہنم کا ایندھن بنا دیا جائے گا۔

اسلامی انقلاب کی فکری اساس

زندگی کے متعلق ان حقائق پر گہرا یقین ہونا ضروری ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اس زندگی کو محض عارضی سفر سمجھے اور حدیث کے مطابق اس حقیقت کو دل میں جاگزیں کر لے کہ میں تو یہاں راہ چلتا مسافر ہوں۔ یہ دنیا میرا گھر نہیں ہے نہ یہ دل لگانے کی جگہ ہے بلکہ یہ امتحان گاہ ہے۔ یہاں تو مجھے جانچا جا رہا ہے۔ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے اور کامیابی و ناکامی اور فیصلے کا دن تو قیامت کا دن ہے۔ یہاں کی ہار معمولی اور یہاں کی جیت عارضی ہے جب کہ وہاں کی ہار جیت مستقل ہے۔ یہ زندگی تو گویا تین گھنٹے کا ایک ڈرامہ ہے جس میں کسی کو فقیر کا کردار مل گیا' لہٰذا اس کے بدن پر چیتھڑے ہیں اور کسی کو بادشاہ کا کردار ملا ہے اور وہ بڑا اعلیٰ لباس زیب تن کیے ہوئے ہے۔ تین گھنٹے کے بعد نہ وہ بادشاہ بادشاہ ہے نہ فقیر فقیر ہے۔ دنیا کی کیفیات' غربت و امارت' عہدے اور مناصب کا یہی حال ہے۔ یہ سب دھوکے کا سامان ہے۔ اسی لیے قرآن مجید کہتا ہے:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾﴾ (آل عمران)

''دنیا کی زندگی تو سوائے دھوکے کے سامان کے اور کچھ نہیں۔''

یہ یقین گویا اس نظامِ حیات کی فکری اساس ہے جس کو ہم قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک یہ حقیقت ہمارے رگ و پے میں سرایت نہ کر جائے' جب تک یہ ایک زندہ یقین کی صورت اختیار نہ کر لے' تب تک وہ قوت پیدا ہو ہی نہیں سکتی جو اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے لازمی ہے اور نہ کبھی انقلاب آ سکے گا۔ البتہ یہ بات بھی ذہن میں ضرور رکھیے ورنہ مغالطہ ہو جائے گا کہ یقین کی یہ گہرائی اور گیرائی تمام کے تمام لوگوں میں نہ تو پہلے کبھی ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگی۔ تمام انسانوں میں یہ یقین تو صرف قیامت کے دن ہی پیدا ہوگا' جب سب

حقائق آنکھوں کے سامنے آجائیں گے۔ لیکن اسلامی نظام کے بالفعل نفاذ کے لیے ضروری ہوگا کہ کسی معاشرے میں ایک مؤثر اقلیت اس یقین سے سرشار ہو جائے اور اپنے یقین کی گہرائی کی بنا پر اسلام کی خاطر ہر قسم کی قربانی اور ایثار کے لیے تیار ہو جائے۔ (واضح رہے کہ میں ''اکثریت'' کا لفظ استعمال نہیں کر رہا' اس لیے کہ میرا دعویٰ ہے کہ اکثریت کی کیفیت کبھی یہ نہیں ہوسکتی۔) جب تک اس قسم کی مؤثر اقلیت پیدا نہ ہو جائے جو ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ''میری نماز' میری عبادت' میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے''۔ کو اپنی زندگی کا مقصد نہ بنالے اور جب تک یہ فکری اساس ان کے دلوں میں پختہ نہ ہو جائے' عملی طور پر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ اسلامی تحریک کی جدوجہد نتیجہ خیز اور کامیاب ہو جائے۔ ہم تمنا تو کرتے رہیں گے کہ اسلام آجائے' اسلام کا نظام حیات قائم ہو جائے' لیکن تمنا سے اسلام نہیں آئے گا۔ ہم مقالے پڑھتے رہیں گے' تقریریں کرتے رہیں گے کہ یہ اسلام ہے اور یہ اسلام نہیں ہے' لیکن اس سے بالفعل اسلامی نظام کی عمارت کی تعمیر ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔

محاسبۂ اُخروی کی بنیاد: پانچ چیزیں

اگلی بات بہت اہم ہے۔ اگر ہماری دنیا کی زندگی امتحان ہے تو امتحان تو کچھ سکھا کر لیا جاتا ہے یا کچھ دے کر آدمی کو جانچا جاتا ہے۔ آپ کو اپنے بچے کے رجحان کا اندازہ کرنا ہو تو آپ اُسے دس روپے دیں گے اور پھر دیکھیں گے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ آیا وہ یہ رقم لے کر باہر جا کر چاٹ کھالیتا ہے یا کوئی کتاب خریدتا ہے یا پھر کوئی کھلونا خرید لاتا ہے۔ گویا آپ اسے کچھ دے کر جانچیں گے۔ آپ کسی کو کچھ اختیار دیجیے' پھر پتا چلے گا کہ اس کا رجحان کیا ہے' خیر کی طرف ہے یا شر کی طرف! آپ کچھ نہ کچھ چوائس دیں گے تو پھر ہی کسی کی آزمائش کر سکیں گے۔ ہمیں جو یہاں امتحان گاہ میں ڈالا گیا ہے تو سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا سکھایا گیا اور کیا دیا گیا' جس کی بنیاد پر ہماری آزمائش کی جارہی ہے؟ ایمان بالآخرت کے ایک اہم نکتے کو سمجھنے کے لیے یہ بہت اہم سوال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس امتحان گاہ میں کئی چیزیں دے کر بھیجا ہے۔

سب سے پہلی شے جو اللہ نے ہمیں دی' وہ سماعت و بصارت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف آیات میں اس کا تذکرہ فرمایا:

﴿قُلْ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ﴾
(الملک:۲۳)

''کہہ دیجیے اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے لیے کان' آنکھ اور دل بنایا۔''

﴿وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ﴾ (المؤمنون:۷۸)

''اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے کان' آنکھیں اور دل بنائے ہیں۔''

سماعت اور بصارت ہمارا پہلا اثاثہ ہے۔ یہ اللہ کی دی ہوئی وہ faculties ہیں جن کی بنیاد پر ہم مسئول اور ذمہ دار ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہی بات بایں الفاظ کہی گئی ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾﴾

''اور (اے بندے) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔ یقیناً کان' آنکھ اور دل ان سب (جوارح) کے بارے میں ضرور باز پرس ہوگی۔''

دوسری شے جو اللہ نے ہمیں دی وہ عقل ہے۔ اللہ نے ہم میں سے ہر شخص کے دماغ میں ایک کمپیوٹر نصب کیا ہے۔ اس میں جو بھی sense data فیڈ کیا جا رہا ہے اُس کو آپ process کر کے اُس سے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ علم کے ذرائع میں تجربہ اور عقل یہ دو چیزیں تو وہ ہیں جو ہر شخص کو معلوم ہیں اور ہر انسان کے پاس ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کے پاس کم اور کسی کے پاس زیادہ ہیں۔

تیسری چیز جو اللہ نے ہمیں عطا فرمائی' وہ نیکی اور بدی کا شعور ہے۔ اس کے لیے انسان کو محنت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر انسان اپنی فطرت کی بنیاد پر یہ جانتا ہے کہ کیا خیر ہے اور کیا شر ہے' کیا بھلائی ہے اور کیا برائی' کیا نیکی ہے اور کیا بدی! اس کو پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خداداد شے ہے۔ چنانچہ سورۃ الشمس میں فرمایا:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ (الشمس)

''اور (قسم ہے) انسان کی اور اس کی جس نے اس کے اعضاء کو برابر کیا۔ پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری (اختیار کرنے) کی سمجھ دی۔''

یعنی نفسِ انسانی جو اللہ نے بنایا اور تیار کیا' اللہ نے اس کے اندر نیکی اور بدی کا شعور بھی پیدا کر دیا۔ یہ شعور آپ کو حیوانات میں نہیں ملے گا۔ اسی شعور کا ایک مظہر انسان میں اخلاقی حس

ہے' جو برائی پر روک ٹوک کرتی ہے۔ یہ تین چیزیں (یعنی ہمارے sense organs جن سے ہم معلومات اخذ کرتے ہیں' ہمارے دماغ کا کمپیوٹر جس سے ہم اس تمام sense data کو process کرتے ہیں' اور خیر و شر کا امتیاز اور اس کا شعور) ہمارے نفس میں ودیعت شدہ ہیں۔ یہ ہمارے حیوانی وجود کے عناصر ہیں۔

ان کے علاوہ جو شے ہمیں دی گئی ہے وہ روح ہے' جو ہمارے اندر پھونکی گئی ہے اور جس کی نسبت ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ .....﴾ (السجدۃ:۹)

''پھر اللہ نے اس (انسان) کی نوک پلک درست کی اور اس میں اپنی روح میں سے پھونکا۔''

اس میں دو چیزیں موجود ہیں' ایک اپنے رب کی معرفت اور دوسرے اپنے رب کی انتہائی گہری محبت۔ تو مجموعی طور پر یہ پانچ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے دے کر ہمیں دنیا میں بھیجا ہے۔

اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے' وہ نہایت اہم ہے۔ یعنی اگر کوئی نبی اور رسول نہ آتا' کوئی کتاب بھی نازل نہ ہوتی' کوئی وحی بھی نہ اُترتی' تب بھی ان چیزوں کی بنیاد پر انسان مکلّف اور جواب دہ تھا' اس لیے کہ ان پانچ چیزوں کی مدد سے اسے ہر سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ چنانچہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے رہے ہیں' جن تک کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی اور ہوسکتا ہے کہ آج بھی سائبیریا کے دور دراز گوشوں میں کہیں ایسے لوگ موجود ہوں جو یہ جانتے بھی نہ ہوں کہ نبی آخر الزمانؐ دنیا میں تشریف لائے تھے' محمد ﷺ نامی جلیل القدر' رفیع الشان شخصیت دنیا میں گزری ہے' پھر بھی یہ لوگ اللہ کے سامنے جوابدہ ہوں گے اور ان کا حساب کتاب ہوگا۔ اچھی طرح جان لیجیے' جواب دہی کی اصل بنیاد متذکرہ بالا پانچ چیزیں ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ہر بندے پر اصل حجت ہیں۔ البتہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہے کہ اس نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر دور میں اپنے نبی اور رسول بھیجے اور اُن پر اپنا کلام نازل فرمایا۔ اللہ کے یہ منتخب بندے سیرت و کردار کے نہایت اعلیٰ نمونے تھے۔ اُن کا دامنِ کردار بے داغ اور اُن کی زندگیاں کھلی کتاب کی مانند تھیں۔ یہ عالی مرتبت ہستیاں اعلانِ نبوت سے پہلے ہی اپنے معاشرے کے اندر چمکتی دمکتی مشعلیں تھیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کی مدد سے ایمانی حقائق کو لوگوں پر منکشف کر دیا۔

قرآن کریم میں موجود جلی اور مخفی حقیقتوں کا یقینِ کامل

میں نے آپ کے سامنے جو کچھ بیان کیا' اس میں کچھ تو جلی اور واضح چیزیں ہیں جو ہر فرد

کے ذہن کی گرفت میں آسکتی ہیں اور جو ہر شخص کے لیے لازمی بھی ہیں۔ یہ چیزیں آپ کو قرآن کے ہر صفحے پر مل جائیں گی' جبکہ کچھ چیزیں اشارات کی صورت میں آئی ہیں۔

وہ چیزیں جو ہر شخص کے جاننے کی ہیں اور قرآن میں جلی انداز سے آئی ہیں' ان میں سے پہلی شے ایمان باللہ ہے۔ ایمان باللہ ہی انسان میں نیکی کا جذبۂ محرکہ (motivative force) پیدا کرنے والی اصل شے ہے۔ دل میں ایمان موجود ہو تو آدمی اللہ کی محبت کی بنا پر بھلائی کے کام کرتا ہے اور اللہ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لیے بدی سے رکتا ہے۔ وہ ہر دم ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں میرا اللہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ ایمان باللہ گویا مثبت قوتِ محرکہ ہے۔ دوسری شے ایمان بالآخرت ہے۔ ایمان بالآخرت بھی قوت محرکہ ہے' لیکن یہ ایک طرح کا کوڑا ہے۔ یہ یقین کہ قیامت کے دن حساب کتاب ہوگا' جواب دہی ہوگی' میرا ایک ایک عمل میرے سامنے آجائے گا' یہ دراصل انسان کے اندر اُسے شر سے بچانے کی اور خیر کی طرف راغب کرنے کی ایک منفی قوت ہے' اگرچہ اس کا بھی ایک مثبت پہلو ہے۔ بہرحال یہ دونوں چیزیں اتنی اہم ہیں کہ ہر فرد کی ضرورت ہے۔ شیخ احمد سرہندیؒ نے انہی کو مبدأ و معاد سے تعبیر کیا ہے۔ تیسری چیز ایمان بالرسالت ہے۔ ایمان بالملائکہ' ایمان بالکتاب اور ایمان بالرسل یہ تینوں ایمان بالرسالت کے اجزاء ہیں۔

البتہ بعض حقائق جو ذرا مخفی ہیں' قرآن میں اشارات کی صورت میں آئے ہیں۔ مثلاً اس دنیا میں آنے سے پہلے بھی ہماری ایک زندگی ہے' قرآن نے اس کو زیادہ نمایاں نہیں کیا' صرف ایک دو مقامات پر اشارے دیے ہیں۔ مثلاً قرآن حکیم میں اہل جہنم کی فریاد نقل ہوئی ہے:

﴿قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ﴿١١﴾﴾ (المؤمن)

''وہ کہیں گے: اے ہمارے رب' تو نے ہمیں دو مرتبہ مارا اور دو مرتبہ زندہ کیا' پس ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں' تو کیا اب یہاں سے نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہے؟''

اللہ تعالیٰ نے عالمِ ارواح میں ہماری روحوں کو پیدا کیا۔ اس کے بعد ارواح کو گویا کسی کولڈ سٹوریج میں رکھ دیا۔ یہ گویا اماتتِ اولیٰ ہے۔ پھر انسان کا یہاں احیاء ہوا' جب اس کے جسد خاکی کے ساتھ جو رحم مادر میں تیار ہوا' اس کی روح کو شامل کیا گیا۔ یہ احیائے اولیٰ ہے۔ پھر اس پر موت واقع ہوگی جب انسان اس دنیا کو چھوڑ جائے گا' اور یہ ''اماتتِ ثانیہ'' ہوگا' جس

کے بعد انسان کا زمین والا حصہ زمین میں رہ جائے گا اور جو آسمان سے آیا تھا وہ آسمان کی طرف چلا جائے گا۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى﴾ (طٰہٰ) ''اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے دوسری دفعہ نکالیں گے''۔ تا آنکہ جب بعث بعد الموت کا مرحلہ آجائے گا تو انسان کو زمین سے نکالا جائے گا۔ یہ گویا دو اماتتیں اور دو احیاء ہو گئے جو سورۃ المؤمن کی مذکورہ بالا آیت میں بیان ہوئے۔

اسی طرح اس بات کی طرف بھی صرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے اور اُس کا اصل وجود کون سا ہے؟ انسان کا اصل وجود یہ جسد حیوانی نہیں بلکہ کچھ اور (روحِ ربانی) ہے۔ اللہ تعالیٰ اور روح انسانی کے درمیان اتنا گہرا ربط و تعلق ہے کہ جب انسان اللہ کو بھول جاتا ہے تو گویا اپنے وجود کو بھی بھلا دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ (الحشر:۱۹) ''ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے ان کو اپنے آپ سے غافل کر دیا''۔ یعنی اللہ کو بھلانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنی حقیقت کو فراموش کر بیٹھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھنے کے بجائے، بس زیادہ ارتقاء یافتہ حیوان سمجھ لیا۔ یہ دراصل اللہ کو بھلانے کی نقد سزا ہے جو انہیں اسی دُنیا میں مل رہی ہے۔ یہاں ''اَنْفُسَهُمْ'' (اپنے آپ) سے مراد وجودِ حیوانی نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ کوئی بھی شخص اپنے حیوانی وجود کو نہیں بھولتا۔ اس کا نفع و نقصان اور اس کی تکلیف و راحت کا خیال تو اُسے ہر دم رہتا۔ اسی کو تو خوش رکھنے کی خاطر وہ حلال و حرام کی بھی پروا نہیں کرتا۔ انسان اپنے جس وجود سے غافل ہو جاتا ہے وہ دراصل اُس کا روحانی وجود ہے، اور یہی اصل وجود ہے۔ اُپنشد کا ایک بہت خوبصورت جملہ ہے:

"Man in his ignorance identifies himself with the material sheeths which encompass his real self."

انسان کی اصل انا، اس کی اصل خودی اس کا وہ روحانی وجود ہے جو حقیقت میں مسجودِ ملائک بنا، نہ کہ یہ حیوانِ انسان۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ﴾ (صٓ)

''پھر جب میں اس کو درست کر لوں اور اُس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔''

افسوس کہ انسان اپنے اصل روحانی وجود کو بھول گیا۔ جب تک اسلامی نظامِ حیات کی یہ فکری اساس ہمارے اندر مستحکم نہ ہو جائے' حقیقتِ کائنات کا یہ پورا تصور دل و دماغ میں راسخ نہ ہو جائے' تب تک اسلامی نظامِ حیات کا نفاذ' اسلامی انقلاب' یہ صرف ایک آرزو اور تمنا ہی رہے گی۔ اسلامی نظام کے بالفعل نفاذ کے لیے پہلا کام یہ ہے کہ فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو ہو اور ایمان ایک روشن یقین (burning faith) کی شکل اختیار کرے' اگلا قدم پھر ہی اٹھ سکے گا۔

یقینِ قلبی کا ذریعہ: قرآن مجید

اب مجھے آخری بات یہ عرض کرنی ہے۔ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی تفصیلات میں تو کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے' لیکن کم از کم اس کی واضح اور کھلی کھلی باتیں تو ہر مسلمان مانتا ہے' البتہ اصل کمی یقین کی ہے اور یقینِ قلبی بہت ضروری ہے۔ بقول اقبال ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

لیکن اب سوال یہ ہے کہ وہ یقین کیسے پیدا ہو؟ یہ یقین کہاں سے آئے؟ اس کے لیے میں پھر عرض کروں گا کہ اس کا ذریعہ قرآن حکیم ہے۔ قرآن حکیم میں حضور ﷺ سے خطاب ہوا:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ﴾ (الشوریٰ)

''اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری طرف روح القدس کے ذریعے سے (قرآن) بھیجا ہے۔ تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو' لیکن ہم نے اس کو نور بنایا ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔ اور بے شک (اے محمدؐ) تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو۔''

حضور ﷺ جو یقینِ مجسم بنے اور پھر آپؐ سے یہ یقین معاشرے کے اندر متعدی ہوا اور لوگوں میں پھیلا' قرآن مجید اس کا بھی یہی synthesis کرتا ہے۔ سورۃ الضحیٰ میں فرمایا: ﴿وَوَجَدَكَ ضَاۗلًّا فَهَدٰى ۝﴾ ''اور اُس نے آپؐ کو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو ہدایت دی۔'' یعنی آپؐ تفکر و اعتبار (غور و فکر) کے مراحل طے کرتے ہوئے جب ایسے مرحلے

تک جا پہنچے گویا حقیقت کے دروازے پر دستک دی' تو آپؐ پر دروازے وا کر دیے گئے۔ پھر اس کے بعد اس میں یقین کا رنگ وحی کے ذریعے سے پیدا ہوا۔ آج ہمارے دلوں میں اگر ایمان کی شمع روشن ہوسکتی ہے تو اسی نورِ وحی یعنی آیاتِ قرآنی سے ہوسکتی ہے۔ اللہ کی کتاب ہی ہمارے اندر ایمان کی جوت جگا سکتی ہے۔ اللہ کی معرفت یوں تو ہمارے دلوں میں موجود ہے' لیکن وہ خوابیدہ (dormant) ہے۔ اسے بیدار کرنے کے لیے آیاتِ قرآنیہ نازل ہوئی ہیں اور یہ قرآن مجید ہی کے ذریعے activate ہوسکتی ہے ؎

ایسے کچھ تار بھی ہیں سازِ حقیقت میں نہاں
چھو سکے گا نہ جنہیں زخمۂ مضرابِ حواس

انسان کی فکری سطح پر ایمان کو activate کرنے کے لیے تو آیاتِ آفاقیہ موجود ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾

(حٰمٓ السجدہ :۵۳)

''ہم عنقریب اُن کو اطرافِ عالم میں اور خود اُن کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے' یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔''

لیکن اُس کے اندر کے تاروں کو چھیڑنے کے لیے آیاتِ قرآنیہ کا نزول ہوا ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (البقرۃ:۲۵۷)

''جو لوگ ایمان لائے ہیں اُن کا دوست اللہ ہے جو ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے۔''

وہ لوگ جو ذہنی صلاحیتیں رکھتے ہوں اور جنہوں نے غور و فکر کے مراحل طے کیے ہوں' ان کے اندر قرآن مجید کی آیات ہی کے ذریعے سے یہ ایمان اُبھرے گا اور اسی کے ذریعے فکر کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ آپ غالب کا ایک شعر سنتے ہیں تو جھوم جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس شعر نے آپ کے وجود کے اندر کے تاروں میں سے کسی تار کو چھیڑ دیا ہے۔ آپ کا اپنا کوئی احساس تھا جو اس شعر کے ذریعے متحرک ہوا اور آپ جھوم گئے۔

ایمان و یقین حواس کے مشاہدے اور خارجی تجربہ سے پیدا نہیں ہوسکتا۔ علامہ اقبال نے تو یہاں تک ثابت کیا ہے کہ خارجی تجربہ بسا اوقات انسان کو دھوکا دے دیتا ہے۔ مثلاً آپ ایک گرم چیز کو زیادہ دیر چھونے کے بعد کم گرم شے کو چھوئیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ ٹھنڈی ہے۔

لیکن ایک ٹھنڈی شے کو چھونے کے بعد آپ اسی کم گرم شے کو چھوئیں تو معلوم ہوگا کہ وہ گرم ہے۔ اندازہ کیجیے' ایک ہی شے کو آپ کے حواس گرم بھی بتا رہے ہیں اور ٹھنڈا بھی۔ گویا خارجی تجربہ دھوکہ دے سکتا ہے اور اس سے انسان کو طرح طرح کے مغالطے ہو سکتے ہیں۔ یقینِ قلبی آیاتِ قرآنیہ سے پیدا ہوگا۔ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو قرآن کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرتے ہیں گویا یہ قرآن میں لکھا ہوا نہیں ہے' ان کے اپنے دل پر نقش ہے۔ کلام اللہ اور اُن کے دل کے درمیان اتنی ہم آہنگی اور توافق ہوتا ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو میری فطرت کی پکار ہے۔

اسلامی انقلاب کے لیے فکری اساس کی پختگی

آیاتِ قرآنیہ کے ذریعے تزکیہ اگرچہ وقت طلب کام ہے' لیکن یہ انتہائی ناگزیر ہے۔ reconstruction of faith کے لیے یہ محنت بہرحال کرنی پڑے گی۔ ضروری ہے کہ پہلے سماج کے ایک طبقے اور گروہ کے اندر یہ ایمان پیدا ہو' پھر اس طبقے سے یہ متعدی ہو کر کچھ اور لوگوں میں جائے اور یہ یقین اس درجے تک ہو کہ وہ غلبۂ دینِ حق کے لیے اپنا تن من دھن لگا دینے کے لیے تیار ہو جائیں' اُن میں وہ قوت پیدا ہو جائے کہ اللہ کی رضا اور اُخروی فلاح کے لیے اپنی ہر شے قربان کر سکتے ہوں۔ تب صحیح طور پر اسلامی تحریک کے لیے افراد کی تیاری کی پہلی شرط پوری ہوگی۔ ایسے ہی افراد انقلاب کے مراحل سے گزرتے ہوئے وہ انقلاب لائیں گے جس سے اسلام کا نظامِ حیات بالفعل قائم ہو جائے گا۔ اگر ہم محض موروثی عقیدے' جو ہمیں وراثتاً منتقل ہوتا ہوا چلا آ رہا ہے' مگر لوگوں کی سوچ اور ان کے نظامِ اقدار کے اندر سرایت کیے ہوئے نہیں ہے' کی بنیاد پر کوئی جذباتی تحریک اٹھا کر یا کچھ وقتی ہنگامے کھڑے کر کے' مطالبات کا ایک طومار سامنے لا کر' سیاسی تحریکیں چلاتے رہے تو اس سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے جو میں نے بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے' اور ہمیں اُس زندہ ایمان سے نوازے' جسے میں نے ''برننگ فیتھ'' سے تعبیر کیا ہے۔ (آمین)

(مرتب: محبوب الحق عاجز)

❁❁❁

درس ۵

اقامتِ دین کی جدّوجُہد کرنے والی جماعت کی ہیئتِ ترکیبی اور تنظیمی اساس

انجینئر نوید احمد

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝ (الصف)

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ (الفتح:۲۹)

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰي مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (التوبہ)

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰي نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (الفتح)

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ (الفتح)

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (الممتحنة)

☆ تمہیدی نکات:

۱) منتخب نصاب نمبر۲ کا درسِ پنجم سورۃ الصف آیت ۱۴، سورۃ الفتح آیت ۲۹ کے ابتدائی حصہ، سورۃ التوبۃ آیت ۱۱۱، سورۃ الفتح آیات ۱۰ اور ۱۸ اور سورۃ الممتحنۃ آیت ۱۲ کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔

۲) منتخب نصاب نمبر۲ کے درسِ اوّل میں چند مقاماتِ قرآنی کے ذریعہ دینی فرائض کا جامع تصور واضح کیا گیا۔ درسِ دوم میں دینی فرائض میں سے خاص طور پر اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کی فرضیت کو نمایاں کیا گیا۔ درسِ سوم میں اقامتِ دین کی جدوجہد کے مقصد یعنی قیامِ عدل کی وضاحت کی گئی۔ درسِ چہارم میں موجودہ بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے میں اقامتِ دین کے طریقِ کار اور اس حوالے سے آخری اقدام کو واضح کیا گیا۔ اب درسِ پنجم میں ہم اُس جماعت کی اساس، ہیئتِ ترکیبی اور نظم کے تقاضوں کو سمجھیں گے جو اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لیے قائم کی جاتی ہے۔

آیات پر غور و فکر

سورۃ الصّف، آیت ۱۴

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو''..... ﴿كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ ''اللہ کے مددگار بن جاؤ'' ﴿كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ﴾ ''جیسا کہ پکارا تھا مریم کے بیٹے عیسیٰؑ نے اپنے ساتھیوں کو''..... ﴿مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ ''کون ہیں میرے مددگار اللہ کے لیے؟''..... ﴿قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ﴾ ''ساتھیوں نے کہا''..... ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ ''ہم ہیں اللہ کے مددگار''..... ﴿فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ ''تو ایمان لے

آیا ایک گروہ بنی اسرائیل میں سے''..... ﴿وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ﴾ ''اور انکار کر دیا ایک گروہ نے'' ..... ﴿فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ﴾ ''تو ہم نے مدد کی اُن لوگوں کی جو ایمان لائے تھے اُن کے دشمنوں کے خلاف''..... ﴿فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ﴾ ''پھر وہ غالب ہو گئے۔''

سورۃ الصف کی اِس آیت میں ﴿مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ کے الفاظ سے ہمیں یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ غلبۂ دین کی جدّوجہد کے لیے اجتماعیت کیسے وجود میں آتی ہے۔ اِس اجتماعیت کی اساس یہ ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ اُٹھ کر ایک آواز لگاتا ہے: مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ؟ ''کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟''۔ جب تک نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری تھا یہ پکار اللہ کے رسول لگاتے تھے۔ نبوت کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد اب غلبۂ دین کی جدّوجہد اُمتیوں نے کرنی ہے۔ اِس جدوجہد کے لیے کسی اجتماعیت کے وجود میں آنے کی صورت یہی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ پہلے کسی ایک بندے کے دل میں یہ بات ڈالے گا کہ یہ کام کرنا ہے۔ پھر وہ اِس کام کے لیے کھڑا ہوگا اور داعی بن کر لوگوں کو پکارے گا۔ جو لوگ اُس کی اِس پکار پر لبیک کہہ کر حاضر ہوں گے وہ اُس کے ساتھی اور مددگار ہوں گے۔ داعی امیر ہوگا اور ساتھ دینے والے مامور۔ البتہ اب امیر کے ساتھ ایک نسبت قائم کرنے کے لیے مامورین کو ایک عہد کرنا ہوگا۔ اِس عہد کو بیعت کہتے ہیں' جس کا ذکر اگلی آیات میں آئے گا۔

اِس آیت میں اہلِ ایمان کو بہت بڑا اعزاز دیا جا رہا ہے کہ اگر وہ اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے جہاد کریں گے تو اللہ کے مددگار قرار پائیں گے۔ کہاں اللہ اور کہاں انسان! اللہ جو چاہے سو کر سکتا ہے' لیکن ہمارے امتحان کے لیے اُس نے دین کے تقاضے رکھے ہیں۔ اب جو کوئی اِن تقاضوں کو پورا کرے گا وہ اللہ کا مددگار قرار پائے گا۔ سچے اہل ایمان نہ صرف خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر کاربند ہوتے ہیں بلکہ عالمِ واقعہ میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ مال و جان کھپانے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کی قدر افزائی کی جاتی ہے اور اللہ اُنہیں اپنا انصار قرار دیتا ہے۔ بندے کے لیے اِس سے بڑھ کر اور کوئی اونچا مقام نہیں ہو سکتا۔

سورۃ الفتح' آیت ۲۹

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ ''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں''..... ﴿وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ﴾ ''اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں (یہ سب کے سب ایک جماعت ہیں)''..... ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾

''وہ کفار پر سخت ہیں''..... ﴿رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ﴾ ''آپس میں بڑے رحمدل ہیں۔''

سورۃ الفتح کی آخری آیت کا یہ حصہ ہمیں اجتماعیت کے حوالے سے مزید رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے زمانے میں جن باسعادت ہستیوں نے آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی تصدیق کی' وہ فطری طور پر آپ ﷺ کے ساتھی بن گئے۔ اُن کے بارے میں کہا گیا ﴿وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗۤ﴾ ''اور وہ لوگ جو اُن (ﷺ) کے ساتھ ہیں''۔ اُنہوں نے آپ ﷺ کی رفاقت اختیار کر کے ایک اجتماعیت کی صورت اختیار کر لی۔ آپ ﷺ کے ساتھ اُن کی اوّلین نسبت قائم ہوگئی نبی اور اُمتی کی۔ البتہ ایک اضافی نسبت امیر اور مامور کی بھی قائم ہوگئی۔ اِس اضافی نسبت کو نمایاں کرنے والی چیز جو ہمیں قرآن وسنت سے ملتی ہے' اُس کا عنوان ''بیعت'' ہے۔ اِب اس بیعت کے سلسلے میں ہمیں سمجھنا ہے کہ اِس کی اصل اور اِس کا مفہوم کیا ہے؟ قرآنِ حکیم میں بیعت کا ذکر کہاں کہاں آیا ہے؟ بیعت کی کتنی اقسام ہیں؟ سیرت النبی ﷺ میں اِس بیعت کا کس تدریج کے ساتھ ذکر ملتا ہے؟

سورۃ التوبۃ' آیت ۱۱۱

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ ؕ﴾ ''بے شک اللہ نے مؤمنوں سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال خرید لیے ہیں جنت کے بدلے میں''..... ﴿یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ﴾ ''وہ اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں''..... ﴿فَیَقۡتُلُوۡنَ وَیُقۡتَلُوۡنَ ؕ﴾ ''پس قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں''..... ﴿وَعۡدًا عَلَیۡهِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىةِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ ؕ﴾ ''یہ وعدہ اللہ کے ذمہ ہے تورات میں' انجیل میں اور قرآن میں''..... ﴿وَمَنۡ اَوۡفٰی بِعَهۡدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ ''اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدے کا پورا کرنے والا ہو بھی کون سکتا ہے؟'' ﴿فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِهٖ ؕ﴾ ..... ''پس خوشیاں مناؤ اپنے اُس سودے پر جو تم نے اللہ کے ساتھ کیا ہے!''..... ﴿وَذٰلِکَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۱۱﴾﴾ ''اور وہی ہے سب سے بڑی کامیابی۔''

سورۃ التوبۃ کی یہ آیت بیعت کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اِس آیت میں اُس سودے کا ذکر ہے جو ایک شخص کلمہ طیبہ پڑھ کر اللہ کے ساتھ کرتا ہے۔ اِس سودے کے لیے بیع کا لفظ آیا ہے' جس سے لفظ بیعت بنا ہے۔ بیعت کا لفظ ''ب ی ع'' سے بنا ہے۔ عام طور پر عربی میں ''بیع'' کا لفظ بیچنے اور ''اِشتراء'' کا لفظ خریدنے کے معنی میں آتا ہے۔ بائع (بیچنے والا)

اور مشتری (خریدار) کے الفاظ ہمارے ہاں عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ البتہ لفظ ''بیع'' صرف سودے یا لین دین کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسا سودا جو فوری نہ ہو بلکہ ادھار کا ہو تو اِسے ''بیع سَلَم'' کہا جاتا ہے۔ بیع سَلَم میں ایک فریق اپنا حصہ فوری ادا کرتا ہے اور دوسرا فریق مستقبل میں۔ اِس آیت میں اللہ اور اہلِ ایمان کے درمیان بیع سَلَم کا ذکر ہے۔ فرمایا: ''یقیناً اللہ نے اہلِ ایمان سے اُن کی جانیں اور مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں''۔ یہ سودا نقد نہیں ادھار کا ہے۔ جنت تو آخرت میں ملے گی' جبکہ جان و مال یہاں اللہ کی راہ میں لگانے ہوں گے۔

عربوں کے ہاں جب بیع کا معاملہ ہوتا تھا تو چونکہ یہ بات قول و قرار کے درجے میں ہوتی تھی' لہٰذا اِس کو پختہ کرنے کے لیے ہاتھ ملانا اُن کے ہاں ایک علامت کے طور پر رائج تھا۔ جب کوئی سودا طے ہو جاتا اور بات پوری ہو جاتی تو اِس پر وہ مصافحہ (hand shake) کرتے۔ اِس طرح سے مصافحہ کرنے کو بیعت کہا جاتا تھا۔ آیت کے آخر میں سودے کے لیے لفظ ''بیع'' آیا ہے۔ اِسی سے لفظ بیعت بھی بنتا ہے۔ بعض اوقات معاہدہ کسی ادارے کے ساتھ ہوتا ہے لیکن اُس کے لیے ادارے کے نمائندہ سے معاملات طے کیے جاتے ہیں۔ معاہدے پر دستخط کے بعد مصافحہ یعنی بیعت نمائندہ کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اِسی طرح بندۂ مومن کا سودا تو اللہ کے ساتھ ہے لیکن اللہ تعالیٰ ہم سے غیب میں ہے۔ لہٰذا یہ سودا ہوگا اللہ کے نمائندہ یعنی اللہ کے رسول ﷺ کی وساطت سے۔ اِسی لیے سورۃ الفتح آیت ۱۰ میں ارشاد ہوا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ﴾

''بے شک (اے نبی ﷺ) جو لوگ آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں' وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔''

حق و باطل کا معرکہ قیامت تک جاری رہے گا۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد باطل کے خلاف منظم جدّوجہد کے لیے اب بیعت کسی ایسے اُمتی کے ہاتھ پر ہوگی جس کے خلوص و اخلاص' دیانت اور قیادت کی صلاحیت پر اعتماد ہو' لیکن یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ اصل عہد اُس اُمتی سے نہیں بلکہ اللہ سے ہے۔

رسول کے علاوہ کسی اُمتی کے ہاتھ پر بیعت اور اُس کی اطاعت بھاری محسوس ہوتی ہے۔ لیکن نوٹ کیجیے کہ باطل کے خلاف کامیابی کے لیے منظم جدّوجہد ضروری ہے۔ اس کے

لیے تنظیم کے قیام کی منصوص اور مسنون اساس بیعت ہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ رسول کے ساتھ نسبت کے حوالے سے بیعت کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ رسول اور اُمتی کی نسبت اِس سے اہم تر ہے۔ کسی ہستی کو رسول مان لینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اُس کے ہر حکم کی اطاعت کی جائے۔ بیعت کا معاملہ نبی اکرم ﷺ نے اُمت کی رہنمائی کے لیے کیا ہے۔ آپ ﷺ نے امت کو اجتماعیت کے قیام کے لیے بیعت کی اساس ایک سنت کے طور پر عطا فرمائی۔ اقامتِ دین کے لیے اب جب بھی کوئی عملی جدوجہد ہوگی اور کوئی اجتماعیت تشکیل پائے گی تو اُس کے لیے بیعت کی اساس ہی مسنون قرار پائے گی۔

سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ میں بیعت کے علاوہ بیان شدہ دیگر مضامین کی وضاحت درسِ چہارم میں آچکی ہے۔

سورۃ الفتح، آیت ۱۰

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ ''(اے نبیؐ!) جو لوگ آپؐ سے بیعت کر رہے ہیں، حقیقت میں وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں''..... ﴿یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ﴾ ''اللہ کا ہاتھ ہے اُن کے ہاتھوں پر''..... ﴿فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ﴾ ''اب جو اِس عہد کو توڑے گا اُس کی عہد شکنی کا وبال اُسی پر ہوگا''..... ﴿وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝۱۰﴾ ''اور جس نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کیا تو اللہ عنقریب اُسے بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔''

◆ اِس آیت میں بیعتِ رضوان کا ذکر ہے جس کے ذریعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم ﷺ سے حضرت عثمانؓ کی شہادت کا بدلہ لینے کا عہد کیا تھا۔ یہاں واضح الفاظ میں آگاہ کر دیا گیا کہ ایک مسلمان کا سودا اور عہد دراصل اللہ سے ہے۔ عالمِ واقعہ میں صحابہ کرامؓ نبی اکرم ﷺ سے بیعت کر رہے تھے لیکن اُن کی اصل بیعت اللہ سے ہے۔ بیعت لینے والے کا ہاتھ نیچے ہے، بیعت کرنے والے کا ہاتھ اوپر ہے، لیکن اِن ہاتھوں کے اوپر ایک اور ہاتھ ہے اور وہ اللہ کا ہاتھ ہے۔ جو نظم قائم ہوا ہے اُس میں نبی اکرم ﷺ کی حیثیت امیر اور صحابہ کرامؓ کی حیثیت مامورین کی ہے۔ بیعت کرنے والے نبی اکرم ﷺ کے حکم پر جان اور مال حاضر کر دیں گے لیکن اُن کی قربانیاں درحقیقت اللہ کے لیے ہیں۔

◆ آیت میں مزید فرمایا: ﴿فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ .....﴾ ''اب جو

اِس عہد کو توڑے گا اُس کی عہد شکنی کا وبال اُسی پر ہوگا''۔ عہد کا توڑنا اعلانیہ بھی ہوسکتا ہے اور یوں بھی کہ انسان اندر ہی اندر ٹوٹ رہا ہے' قول و قرار سے پھر رہا ہے اور پسپائی اختیار کر رہا ہے۔ جس طرح ایک ارتداد ظاہری ہوتا ہے اور اُس پر مفتی فتویٰ لگاتا ہے' قاضی سزا سناتا ہے اور حد جاری ہوتی ہے' اِسی طرح ایک ارتداد باطنی ہوتا ہے' جس پر مفتی کا فتویٰ یا قاضی کا حکم تو نہیں لگ سکتا لیکن یہ بدترین بیماری کا باعث ہوسکتا ہے' جس کا نام نفاق ہے۔ روزِ قیامت نفاق کی سزا کفر کی سزا سے بھی زیادہ شدید ہوگی۔ لہٰذا ہمیں اپنے گریبانوں میں جھانکتے رہنا چاہیے' کہیں اندر ہی اندر قول و قرار کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی؟ کہیں نفاق دیمک کی طرح ہمارے ایمان اور نیکیوں کو برباد تو نہیں کر رہا؟ عہد سے پھر کر ہم امیر کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ اِس جرم کا وبال ہم پر ہی پڑے گا۔ یہ وبال دنیا و آخرت دونوں کے خسارے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

◆ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۱۰ ...... ﴾ ''اور جس نے اللہ سے کیے گئے عہد کو پورا کیا تو اللہ عنقریب اُسے بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا''۔ اِن الفاظ سے ایک بار پھر واضح ہوا کہ بظاہر بیعت رسول اللہ ﷺ یا کسی داعی سے ہے لیکن درحقیقت یہ عہد اللہ سے ہے۔ عہد نبھایا تو شاندار بدلہ اللہ ہی دے گا اور اگر عہد شکنی کی تو اِس کا وبال بھی اللہ ہی کی طرف سے آئے گا۔ یہ ہے بیعت کی اصل حقیقت کہ جس سے ایک اجتماعیت وجود میں آتی ہے اور پھر امیر اور مامور کی نسبت قائم ہوتی ہے۔

سورۃ الفتح' آیت ۱۸

﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''اللہ تو راضی ہو گیا مؤمنوں سے'' ......﴿اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ ''جب وہ (اے نبی ﷺ) آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے'' ...... ﴿فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ﴾ ''اللہ جانتا تھا اُسے جو کچھ کہ اُن کے دلوں میں تھا'' ...... ﴿فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ﴾ ''پس اللہ نے اُن کے دلوں پر سکینت نازل فرمائی'' ......﴿وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا﴾ ''اور انہیں جلد ہی فتح عنایت فرمادی''

اِس آیت میں اللہ نے اُن صحابہ کرام ﷺ کی تحسین فرمائی جنہوں نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعتِ رضوان کی سعادت حاصل کی اور اُنہیں اپنی خوشنودی عطا کرنے کی بشارت سنائی۔ اِس تحسین اور بشارت کی وجہ یہ تھی کہ یہ بیعت دراصل سیدھا موت کے منہ میں جانے کا

عہد تھا۔ اس بیعت کو بیعت علی الموت بھی کہا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ پکار لگائی تھی میرے ہاتھ پر بیعت کرو کہ ہم قریش سے حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لیں گے یا اپنی جا دے دیں گے۔ پھر یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عمرہ کے لیے احرام باندھے ہوئے خالی ہاتھ آ تھے' اُن میں سے ہر ایک کے پاس صرف ایک تلوار تھی۔ اِس صورتِ حال میں قریش سے ل شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ لیکن جیسے ہی نبی اکرم ﷺ نے پکارا اُنہوں نے لبیک کہا اور جان دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ اِسی لیے اللہ نے اُن کی بھرپور مدح سرائی فرمائی

آیت میں مزید فرمایا کہ اللہ جانتا تھا کہ شوقِ شہادت کے لیے کیسے جذبات اُن کے سینوں میں موجزن تھے اور شہادت کے حصول کی کیسی تمنائیں اُن کے دلوں میں مچل رہی تھیں' بقول جگر مرادآبادی:

جو حق کی خاطر جیتے ہیں' مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر
جب وقتِ شہادت آتا ہے' دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں!

پھر اللہ نے اُنہیں تسکین یعنی قلبی اطمینان عطا فرما دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ہم نہتے ہیں۔ اگر ہم پر اچانک ہجوم ہو جائے' ایک دم حملہ ہو جائے تو کیا ہو گا؟ لیکن نہیں! اُنہیں اللہ کی طرف سے ایک اطمینان اور سکون کی کیفیت نصیب ہو گئی۔ اِس لیے کہ وہ تو جان دینے کا سودا پہلے سے کیے ہوئے تھے اور وہ اِس سودے پر بالکل مطمئن تھے۔ اُنہیں معلوم تھا کہ اِس سے بڑا سودا کوئی نہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ نے اُنہیں بدلے میں قریبی فتح عطا فرمائی۔ اِس فتح سے مراد صلح حدیبیہ بھی ہو سکتی ہے جسے سورۃ الفتح کی پہلی آیت میں ''فتحِ مبین'' قرار دیا گیا اور فتحِ خیبر بھی ہو سکتی ہے جو صلح حدیبیہ کے کچھ ہی عرصہ بعد حاصل ہوئی۔

سورۃ المُمتحنۃ' آیت ۱۲

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ﴾ ''اے نبیؐ! جب آپؐ کے پاس مؤمن خواتین بیعت کرنے کے لیے آئیں''..... ﴿عَلٰۤی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْـًٔا﴾ ''اِس بات پر کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی''..... ﴿وَّلَا یَسْرِقْنَ﴾ ''اور چوری نہیں کریں گی''..... ﴿وَّلَا یَزْنِیْنَ﴾ ''اور بدکاری نہیں کریں گی''..... ﴿وَّلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ﴾ ''اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی''..... ﴿وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ﴾ ''اور اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے کوئی بہتان گھڑ کر نہیں لائیں گی''.....

﴿وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ﴾ ''اور کسی معروف کام میں جو حکم آپ دیں گے اِس سے سرتابی نہیں کریں گی'' ..... ﴿فَبَايِعْهُنَّ﴾ ''تو (اے نبیؐ!) اُن کی بیعت قبول فرمائیے'' ..... ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ﴾ ''اور اللہ سے اُن کے لیے بخشش طلب کیجیے'' ..... ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ ''یقیناً اللہ بہت بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

سورۃ المُمتحنۃ کی اِس آیت میں بیعت النساء یعنی اُس بیعت کے الفاظ مذکور ہیں جو نبی اکرم ﷺ خواتین سے لیتے تھے۔ آپ ﷺ نے کئی مواقع پر مَردوں سے بھی بیعت لی لیکن ایسی کسی بیعت کے الفاظ قرآنِ حکیم میں نقل نہیں ہوئے۔ خواتین کو یہ شرف حاصل ہے کہ اُن کی بیعت کے الفاظ قرآنِ حکیم میں بھی نقل کر دیے گئے۔

ہمارے سامنے قرآنِ حکیم کے چار مقامات آچکے ہیں جن میں بیعت کا لفظ آیا ہے۔ اِن میں سے سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ بیعت کی اصل حقیقت کو واضح کر رہی ہے اور تین آیات میں لفظ بیعت کا ایک اصطلاح کے طور پر ذکر ہے۔ قرآنِ حکیم میں چند ایسے مقامات بھی ہیں جہاں بیعت کی اصطلاح کا ذکر نہیں لیکن سمع وطاعت کے نظم کی اہمیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔

(۱) سورۃ التغابن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ (آیت ۱۶)

''پس اللہ کی نافرمانی سے بچو اپنی امکانی حد تک اور سنو اور اطاعت کرو۔''

اِس آیت پر عمل اُسی وقت ممکن ہے جبکہ کوئی ہمارا امیر ہو اور ہم اُس کا حکم سنیں اور پھر اُسے بجالائیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم ﷺ کا حکم سن کر اطاعت کرتے تھے۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں امارت کا منصب خلفاء کو حاصل تھا۔ لیکن خلافت کے خاتمہ کے بعد اِس حکم پر عمل کی ایک ہی صورت ہے کہ احیائے خلافت کے لیے کوشش کرنے والی جماعت کے امیر کے حکم کو سنا اور مانا جائے۔

(۲) سورۃ البقرۃ رکوع ۳۲ اور ۳۳ میں حضرت طالوت کی جالوت کے ساتھ جنگ کا تذکرہ ہے۔ حضرت طالوت نے نظم کے اعتبار سے اپنے لشکر کا جائزہ لیا۔ اُنہوں نے اپنے ساتھ چلنے والوں سے کہا کہ راستے میں ایک نہر آرہی ہے' جس نے بھی اِس سے سیر ہو کر پانی پیا وہ میرے ساتھ آگے نہ جاسکے گا۔ لہٰذا حضرت طالوت کے ساتھ جنگ میں وہی جواں مرد شریک ہوئے جنھوں نے سمع وطاعت کے نظم کا مظاہرہ کیا۔

(۳) سورۂ آل عمران رکوع ۱۳ تا ۱۸ میں جنگِ اُحد پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اِس جنگ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی شکست کا ذمہ دار اُن حضرات کو قرار دیا جنہوں نے اپنے امیر حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کے حکم کو نہ مانا اور پہاڑی درّہ چھوڑ کر نیچے آ گئے۔ ۳۵ ساتھیوں نے سمع وطاعت کا نظم توڑا' لہٰذا فتح شکست میں بدل گئی اور ۷۰ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔

(۴) سورۃ النمل میں ملکہ سبا کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ ملکہ نے جب اپنے ماتحت سرداروں کے سامنے حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط اور اُن کی طرف سے اُن کے دربار میں پیش ہونے کے حکم کا ذکر کیا تو سرداروں کا جواب سمع وطاعت کے نظم کے عین مطابق تھا:

﴿نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ۝﴾

''ہم بڑے زور آور اور جنگجو ہیں' اب معاملہ آپ کے اختیار میں ہے' آپ دیکھئے کہ کیا حکم دینا چاہتی ہیں۔''

بیعت کی اساس' احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں

قرآنِ حکیم کے علاوہ کئی احادیثِ مبارکہ میں بھی نظمِ جماعت کے لیے بیعت کی اساس پر زور دیا گیا ہے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے سنا اللہ کے رسول ﷺ کو وہ فرما رہے تھے:

((مَنْ خَلَعَ يَدًا مِّنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا حُجَّةَ لَهٗ وَمَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَّاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً)) (۱)

''جس نے امیر کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا وہ روزِ قیامت اللہ سے اِس طرح ملے گا کہ اُس کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی' اور جو کوئی مر گیا اِس حال میں کہ اُس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہ تھا وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

اسلام سے قبل کا دور' دورِ جاہلیت کہلاتا ہے۔ اسلام کے آنے کے بعد تو اب تین ہی صورتیں ممکن ہیں:

i) اسلام غالب ہو اور تمام مسلمانوں نے خلیفۃ المسلمین کے ہاتھ پر بیعت کر رکھی ہو۔

ii) اسلام مغلوب ہو۔ اِس صورت میں ہر مسلمان کو کسی ایسی جماعت کے امیر کے ہاتھ پر

بیعت کر کے اُس جماعت میں شامل ہونا چاہیے جو پھر سے اسلام کو غالب کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

iii) اسلام مغلوب ہو اور کوئی جماعت ایسی موجود نہ ہو جو پھر سے غلبۂ دین کے لیے کوشاں ہو' یا جماعت تو موجود ہو لیکن جماعت کے امیر یا جماعت کے طریقۂ کار سے اہم نوعیت کا اختلاف ہو۔ ایسی صورت میں اختلاف کرنے والے فرد کو چاہیے کہ خود داعی بن کر کھڑا ہو اور لوگوں کو اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کرے۔

(۲) حضرت حارث الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((اَنَا اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ اللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ)) (۲)

''میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں' مجھے اللہ نے ان کا حکم دیا ہے: جماعت اختیار کرنے کا' سننے کا' اطاعت کرنے کا' ہجرت کرنے کا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا۔''

اِس حدیث کے آخر میں ہجرت اور جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ ہجرت اور جہاد دونوں کے درجات ہیں۔ ایک حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں افضل ہجرت ہر اُس کام کو ترک کر دینا ہے جو اللہ کو ناپسند ہو۔ اعلیٰ ہجرت یہ ہے کہ جب کسی معاشرے میں بُرائی کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کی قوت اتنی بڑھ جائے کہ ظالمانہ نظام کے محافظ اُن کی جانوں کے دشمن ہو جائیں اور پھر اُنہیں اپنی اِس سرزمین سے ہی ہجرت کرنی پڑ جائے۔ اِسی طرح افضل جہاد ہے نفس کے خلاف کوشش کرنا تاکہ اُسے شریعت پر عمل کا پابند کیا جا سکے۔ اعلیٰ جہاد اُس وقت ہوتا ہے جب اتنی قوت فراہم کر دی جائے کہ دشمن جہاد کرنے والوں کو کچلنے کے لیے میدان میں آ جائے اور جہاد قتال میں بدل جائے۔ ظلم اور منکرات کے خلاف منظم اجتماعی جدوجہد کے بغیر اعلیٰ ہجرت اور اعلیٰ جہاد کے مراحل آ ہی نہیں سکتے۔ اِسی لیے اِس حدیث میں پہلے جماعت کے التزام کا حکم دیا گیا اور جماعت کا نظم یہ بتایا گیا کہ سنو اور مانو۔ اِس کے بعد ہجرت و جہاد کا ذکر ہے۔

(۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک فرمایا اللہ کے رسول ﷺ نے:

((مَنْ اَطَاعَنِی فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِی فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ)) (۳)

''جس نے میری اطاعت کی پس اُس نے اللہ کی اطاعت کی' اور جس نے میری

نافرمانی کی پس اُس نے اللہ کی نافرمانی کی' اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اُس نے میری اطاعت کی' اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اُس نے میری نافرمانی کی۔''

ایک متفق علیہ یعنی بخاری اور مسلم دونوں میں آنے والی روایت کے مطابق آپ ﷺ نے عمومی طور پر فرمایا:

((مَنْ یُّطِعِ الْاَمِیْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ یَّعْصِ الْاَمِیْرَ فَقَدْ عَصَانِیْ)) (۴)

''جو امیر کی اطاعت کرتا ہے اُس نے میری اطاعت کی' اور جو امیر کی نافرمانی کرتا ہے اُس نے میری نافرمانی کی''۔

اِس حدیثِ مبارکہ میں لفظ ''اَمِیْرِیْ'' کے بجائے ''اَلْاَمِیْر'' ہے' اِس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد امارت کو ایک ادارے (institution) کی حیثیت حاصل ہونی تھی۔ اب یہ تو نہیں ہے کہ ہر ایک کو اِمارت کا پروانہ آپ ﷺ ہی سے ملے گا' بلکہ وہ نظم کہ جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے حکم کی بجاآوری کے لیے قائم کیا جا رہا ہے' اِس میں اصلاً اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کو مطاع مانا گیا ہے۔ اب اِس میں جو بھی نصبِ امارت ہوگا اُس میں بھی نظم کی پابندی درحقیقت اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا مظہر ہوگی۔ پھر اِس حدیثِ مبارکہ میں ماضی کے بجائے مضارع یعنی حال اور مستقبل کے زمانوں کا ذکر ہے۔ گویا قیامت تک جو امیر کی اطاعت کرے گا وہ درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرے گا اور جو امیر کی نافرمانی کرے گا وہ دراصل رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرے گا۔ ہاں امیر کی اطاعت صرف معروف کے دائرے میں ہوگی۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ)) (۵)

''مخلوقات میں سے کسی کی اطاعت جائز نہیں اگر اِس سے خالق کی نافرمانی ہو۔''

(۶) اِنَّهٗ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ وَلَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِاِمَارَةٍ وَلَا اِمَارَةَ اِلَّا بِطَاعَةٍ (۶)

''یقیناً اسلام ہے ہی نہیں بغیر جماعت کے' اور جماعت ہے ہی نہیں بغیر امارت کے' اور امارت ہے ہی نہیں بغیر (امیر کے احکامات کی) اطاعت کے۔''

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی موقوف حدیث ہے' جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ غیر جماعتی زندگی دراصل غیر اسلامی زندگی ہے۔ پھر اصل میں وہی اجتماعیت' جماعت کہلانے کی حقدار ہے جس کا ایک امیر ہو اور اُس امیر کی اطاعت کی جا رہی ہو۔

بیعت کی اساس' سنتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ رسول اور اُمتی کا رشتہ انسانی زندگی کا اہم ترین رشتہ ہے۔ کسی ہستی کو رسول مان لینے کے بعد اُس کے ہر حکم کی اطاعت لازم ہے اور نافرمانی سے انسان کا ایمان ہی معتبر نہیں رہتا۔ سورۃ الاحزاب میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝﴾

''اور جائز نہیں ہے کسی مؤمن مرد اور عورت کے لیے کہ جب اللہ اور اُس کے رسولؐ کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو اب اُن کے لیے کوئی اختیار رہ جائے اُن کے اُس معاملہ میں۔ اور جس کسی نے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی نافرمانی کی پس وہ تو بالکل واضح طور پر بھٹک گیا۔''

لہٰذا نبی کریم ﷺ کو اِس کی ضرورت نہ تھی کہ اپنے اُمتیوں سے سمع و طاعت کی بیعت لیں۔ لیکن آپ ﷺ نے بعد میں آنے والوں کے لیے ایک سنت جاری فرمائی اور مختلف مواقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت لی۔

مکی دَور میں اہلِ مکہ میں سے جو لوگ اسلام لائے' سیرت میں ہمیں اُن سے کسی بیعت کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ اگر کوئی شخص باہر سے آیا اور اس نے آ کر اسلام قبول کیا تو اُس سے بیعت لینے کا ذکر روایات میں موجود ہے۔ تاہم مدنی دور میں آپ ﷺ کا کئی مواقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت لینے کا ذکر روایات میں موجود ہے۔

امام نسائیؒ نے اپنے مجموعۂ حدیث کی جلد دوم ''کِتَابُ الْبَیْعَۃِ'' میں نبی اکرم ﷺ کی مختلف عنوانات سے مندرجہ ذیل دس بیعتوں کا ذکر کیا ہے:

i) البیعة علی السمع والطاعة
ii) البیعة علی الاثر
iii) البیعة علی ان لا ننازع الامر اهله
iv) البیعة علی الموت
v) البیعة علی القول بالحق
vi) البیعة علی القول بالعدل
vii) البیعة علی النصح لکل مسلم
viii) البیعة علی ان نفر
ix) البیعة علی الجهاد
x) البیعة علی الهجرة

بلاشبہ آپ ﷺ نے کئی مواقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت لی' لیکن بنیادی طور پر اہمیت دو بیعتوں کی ہے۔ ایک ہے بیعتِ اسلام' یعنی بیعتِ عقبۂ اُولیٰ اور دوسری ہے بیعتِ سمع وطاعت' یعنی بیعتِ عقبۂ ثانیہ۔

سن ۱۲ نبویؐ میں نبی اکرم ﷺ نے عقبہ کے مقام پر مدینہ سے آنے والے بارہ افراد سے بیعت لی' اسے بیعتِ عقبۂ اُولیٰ کہتے ہیں۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ایک سال قبل حج کے دنوں میں مدینہ سے آنے والے چھ افراد ایمان لائے تھے۔ اُنہوں نے مدینہ جا کر دوسروں کو بھی ایمان کی دعوت دی اور سن ۱۲ نبویؐ میں مجموعی طور پر بارہ ساتھی مدینہ سے آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اُنہی سے آپ ﷺ نے بیعت لی۔ اس بیعت کے الفاظ تقریباً وہی تھے جو کم وبیش دس برس بعد بیعت النساء کے ضمن میں نازل ہوئے اور ابھی ہم نے سورۃ الممتحنۃ کی آیت ۱۲ میں پڑھے ہیں۔ گویا اس بیعت میں کسی نظمِ جماعت کا ایک بیج تو موجود ہے' حکم ماننے کا اقرار ہو رہا ہے کہ جو بھی نیکی کی بات آپ ﷺ فرمائیں گے ہم مانیں گے' لیکن اس میں نظمِ جماعت' سمع وطاعت اور اس کے مختلف لوازم کو ظاہر نہیں کیا گیا۔ البتہ جس طرح بیج کے اندر پورا پودا موجود ہوتا ہے اسی طرح یہ لوازم اسی بیعت میں بالقوۃ (potentially) موجود تھے۔ بعد میں بیعتِ ارشاد کے لیے اسی بیعت سے رہنمائی حاصل کی گئی۔ اس بیعت میں شرک' چوری' بدکاری' قتلِ اولاد اور بہتان طرازی سے اجتناب کا عہد ہے۔

سن ۱۳ نبویؐ میں آپ ﷺ نے اہلِ مدینہ سے جو بیعت لی' اُسے بیعتِ عقبۂ ثانیہ کہتے ہیں۔ بیعتِ عقبۂ اُولیٰ کے موقع پر اہلِ مدینہ نے آپ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ ہمیں اپنا کوئی ایسا ساتھی دیجیے جو ہمیں قرآن پڑھا سکے۔ آپ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو اُن کے ساتھ روانہ کیا۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ کو بھی بھیج دیا۔ اِن دونوں حضرات کی تعلیم اور تبلیغ سے سن ۱۳ نبویؐ میں ۷۲ مرد اور ۳ خواتین مکہ حاضر ہوئے۔ آپؐ نے باقاعدہ اُن کے درمیان ایک نظم قائم فرمایا' بارہ نقیب مقرر فرمائے اور بیعتِ عقبہ ثانیہ لی۔ یہ بیعت سرتاسر نظمِ جماعت کی بیعت ہے۔

یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ ایک حقیقی قائد کو اپنی اطاعت کے لیے بیعت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ساتھی اُس کے حکم پر نہیں بلکہ اشارہ پر ہی جان نچھاور کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ بیعت کی ضرورت دراصل ایک نظامِ اطاعت کے لیے ہوتی ہے' جہاں معاملہ ذیلی منصب داروں کی

اطاعت کا ہوتا ہے۔ مکہ میں نبی اکرم ﷺ بنفسِ نفیس موجود تھے لہٰذا آپ ﷺ نے مکی دور میں مکہ والوں سے بیعت نہیں لی۔ البتہ اہل مدینہ کے لیے معاملہ صرف آپ ﷺ کی اطاعت کا نہیں تھا بلکہ آپ ﷺ کے مقرر کردہ نقباء کی اطاعت کا بھی تھا۔ مدینہ میں دعوت و تربیت کے امور کے نگران یہی نقباء تھے۔ اہل مدینہ کو اِن کی اطاعت کرنا تھی۔ قائد کے علاوہ کسی ذیلی امیر کی اطاعت طبیعت پر ناگوار گزرتی ہے لیکن نظم اُسی وقت مثالی اور مفید ہوسکتا ہے جب اِس اطاعت کا بھی پورے جذبہ کے ساتھ اہتمام کیا جائے۔ اِس نکتہ کو سامنے رکھتے ہوئے اب ذرا بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے الفاظ پر غور کیجیے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَعَلٰى اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَانَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ وفی روایة : وَعَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ اِلَّا اَنْ تَرَوْ كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ فِيْهِ مِنَ اللّٰهِ بُرْهَانٌ (۷)

''ہم نے اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت کی' سننے اور اطاعت کرنے کی' مشکل اور آسانی میں' دلی آمادگی اور ناگواری میں (یعنی موڈ ہو یا نہ ہو) اور خواہ کسی کو ہم پر ترجیح دے دی جائے (یعنی ہم پر امیر بنا دیا جائے) اور یہ کہ ہم ذمہ دار حضرات سے نہیں جھگڑیں گے' اور یہ کہ ہم جہاں کہیں ہوں گے حق بات ضرور کہیں گے' اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ کریں گے۔ ایک اور روایت میں یہ اضافہ ہے: اور یہ کہ ہم ذمہ دار حضرات سے نہیں جھگڑیں گے سوائے اِس کے کہ تم دیکھو (صاحبِ امر کی طرف سے) کوئی کھلم کھلا کفر' جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل موجود ہو۔''

بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے الفاظ میں ایک مضبوط نظم قائم کرنے کے لیے ایک حصار قائم کر دیا گیا ہے اور بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا گیا۔ اِس کے مظاہر حسبِ ذیل ہیں:

۱) عہد کیا جا رہا ہے کہ ہم حکم سنیں گے اور مانیں گے' چاہے مشکل ہو یا آسانی' مالی اعتبار سے تنگی ہو یا خوشحالی' کوئی ناراض ہو یا خوش' ہم ہر صورت میں سمع و طاعت پر کاربند رہیں گے۔

۲) طبیعت میں آمادگی ہو یا ناگواری' ہم نظم کی پابندی کریں گے۔ انسان جب کسی چیز سے

متفق ہوتا ہے تو اِس کے لیے کام کرنے میں طبیعت آمادہ ہوتی ہے۔ کسی معاملہ کا فیصلہ اُس کی رائے کے مطابق ہو تو آمادگی ہوگی۔ اگر فیصلہ برعکس ہو تو ناگواری۔ مضبوط نظم کی روح یہ ہے کہ دونوں حالتوں میں پورے خلوص اور جذبہ کے ساتھ فیصلہ کو درست ثابت کرنے کے لیے فعال کردار ادا کیا جائے۔ اگر آدمی طے کر لے کہ فیصلہ میری مرضی کے مطابق ہوگا تو ساتھ دوں گا ورنہ نہیں، تو یہ جماعتی اعتبار سے منافقت ہے۔ اِس کی سب سے نمایاں مثال غزوۂ اُحد میں سامنے آئی جب عبداللہ بن اُبی اپنے تین سو آدمیوں کے ساتھ یہ کہہ کر واپس لوٹ گیا کہ جب ہمارے مشورے پر عمل نہیں ہوتا تو ہم خواہ مخواہ اپنی جانیں خطرے میں کیوں ڈالیں؟ اُس کی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر محصور ہو کر دفاع کیا جائے جبکہ آپ ﷺ نے باہر نکل کر دشمن سے مقابلہ کا فیصلہ فرمایا تھا۔ عبداللہ بن اُبی کا کہنا تھا: هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ ..... ''ہمارے ہاتھ میں بھی کوئی اختیار ہے کہ نہیں؟'' فیصلہ کرتے ہوئے ہماری بات نہیں مانی گئی لہٰذا ہم ساتھ نہیں دیں گے!! یہ ہے وہ چیز جس کا سدِباب کیا گیا اِن الفاظ میں کہ چاہے ہماری طبیعت میں نشاط ہو یا ہمیں اپنی طبیعت پر جبر کرنا پڑے، ہم حکم سنیں گے اور مانیں گے۔

۳) عہد کیا جا رہا ہے کہ چاہے ہم پر کسی کو بھی ترجیح دے کر امیر بنا دیا جائے ہم اطاعت کریں گے۔ یہ جماعتی زندگی میں نظم کی لڑی (chain) ہوتی ہے۔ جماعت کا امیر مختلف امور کے لیے ذمہ داران کا تقرر کرتا ہے اور کچھ لوگ اُن کے مامور ہوتے ہیں۔ سوائے جماعت کے امیر کے باقی ذمہ داران امیر بھی ہوتے ہیں اور مامور بھی۔ اپنے سے نیچے والوں کے امیر اور اپنے سے اوپر والے کے مامور۔ اب کوئی یہ نہیں کہے گا کہ میں زیادہ باصلاحیت ہوں اور مجھ پر کم صلاحیت والے کو کیوں امیر بنا دیا گیا ہے؟ ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا خود پسندی، تکبر اور انانیت کا مظہر ہے، جس سے بچنے کی شعوری کوشش کرنی چاہیے۔ ترمذی شریف کی روایت کے مطابق آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ چاہے تم پر ایک حبشی غلام کو امیر بنا دیا جائے پھر بھی اُس کی اطاعت کرو۔ بخاری و مسلم کی یہ روایت اِس سے پہلے بیان ہو چکی ہے کہ جو امیر کی اطاعت کرتا ہے اُس نے میری اطاعت کی اور جو امیر کی نافرمانی کرتا ہے اُس نے میری نافرمانی کی۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کا امتحان اِس طرح لیا کہ نوجوان صحابی حضرت اسامہ بن زیدؓ کو ایک لشکر کا امیر بنا دیا۔ اُن کے مامورین میں کئی ایسے صحابہؓ تھے جو عمر اور تجربہ میں اُن سے کہیں زیادہ پختہ تھے۔ کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں تھا کہ امیر بنانے کا کوئی معیار، ضابطہ اور قانون ہونا چاہیے، یہ کیا ہے

کہ بس ایک شخص پسند آ گیا اور اُس کو امیر بنا دیا۔ اِس طرح کے انتشار پیدا کرنے والے فتنہ کا سدباب بیعت کے اِن الفاظ کے ذریعہ کر دیا گیا کہ چاہے دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے پھر بھی ہم سمع وطاعت پر کاربند رہیں گے۔

۴) یہ عہد کیا جا رہا ہے کہ ہم اصحابِ امر سے جھگڑیں گے نہیں۔ البتہ ایک روایت میں ہے کہ اگر صاحبِ امر کی طرف سے کوئی کھلم کھلا کفر کا معاملہ ہو جس کے بارے میں اللہ کی طرف سے کوئی دلیل موجود ہو تو پھر جھگڑا کیا جا سکتا ہے۔ معمولی اختلافات' تعبیر کے فرق یا تدبیر میں اختلافِ رائے کی بنیاد پر کوئی جھگڑا کرنا اور جماعت میں انتشار پیدا کرنا بیعت کی خلاف ورزی شمار ہوگا۔

۵) بیعت کے اگلے الفاظ ہیں کہ ہم حق بات ضرور کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں' اور ہم اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے۔ اِن الفاظ کے ذریعے عقیدت کی بنیاد پر سمع وطاعت میں غلو کا راستہ بند کر دیا گیا۔ اِسی غلو سے شخصیت پرستی پیدا ہوتی ہے۔ اندھے' بہرے اور گونگے بن کر نہیں چلنا۔ اپنی سوچ اور عقل پر پہرے نہیں بٹھانے۔ اللہ نے جو استعدادات دی ہیں' اُن کو بھرپور طریقے پر استعمال کرنا ہے۔ اِن کی روشنی میں جو رائے بنے اُس کے بیان کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرنی' نہ کسی کے رُعب یا عقیدت کو رکاوٹ بننے دینا ہے اور نہ کسی ملامت کرنے والے کے خوف سے اپنی زبانوں پر تالے ڈالنے ہیں۔

اسلامی نظمِ جماعت میں اظہارِ رائے یا مشورہ دینا حق نہیں بلکہ فرض ہے۔ اگر کوئی رائے ہے تو ضرور دی جائے لیکن اِس کے بعد اپنی رائے منوانے پر اصرار نہ کیا جائے۔ اپنی بات منوانے پر اصرار تو عبداللہ بن اُبی کا طرزِ عمل ہے۔ رائے دی' فرض ادا ہو گیا اور انسان عنداللہ بَری ہو گیا۔ اب معاملہ صاحبِ امر کا ہے۔ اُس نے ساتھیوں کو گن کر نہیں بلکہ تول کر فیصلہ کرنا ہے۔

اِس حدیثِ مبارکہ میں اسلامی نظمِ جماعت کے جتنے بھی دستوری تقاضے ہیں سب کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ نظم اور ڈسپلن کے اعتبار سے بیعت کرنے والوں کو اِس طرح پابند کیا گیا ہے کہ کہیں کوئی رخنہ باقی نہیں چھوڑا گیا۔ دین کے غلبہ کا کٹھن کام کرنا ہے تو اِس کے لیے ایک مضبوط نظم والی جماعت چاہیے۔ اِس نظم کے لیے کامل رہنمائی یہ حدیثِ مبارکہ فراہم کر رہی

ہے۔ اِس حدیث کا تو ایک ایک لفظ ہم میں سے ہر رفیق کو زبانی یاد ہونا چاہیے اور اِس میں بیان شدہ تقاضوں کا پورا شعور ہونا چاہیے۔ ہمیں اپنی اجتماعی ہیئت کو بالکلیہ اِس پوری حدیث کے سانچے میں ڈھالنا چاہیے اور اب بالکلیہ اِسی بیعت کے نظام پر اپنے پورے ڈسپلن اور اپنے پورے ڈھانچے کو کھڑا کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اِس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

نظمِ اجتماعی کا شعور اور صحابہ کرامؓ

سن ۵ ہجری میں غزوۂ احزاب سے قبل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خندق کھودنے کا انتہائی پُر مشقت کام کر رہے تھے' لیکن اپنے جذباتِ دینی کو تقویت دینے کے لیے باہم مل کر یہ شعر پڑھ رہے تھے:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا (۸)

''ہم ہیں وہ لوگ جنہوں نے محمد ﷺ سے جہاد کی بیعت کی۔ اب یہ جہاد جاری رہے گا جب تک ہمارے جسم و جان کا رشتہ برقرار ہے۔''

صحابہ کرامؓ کے اندر اِس نظم کا شعور اِس قدر پیدا ہو چکا تھا کہ ہر شخص ہر وقت یہ نوٹ کرتا کہ اِس وقت میں کس حیثیت میں ہوں اور دوسرا شخص کس حیثیت میں ہے؟ آیا ہم' ہم مرتبہ (equi-status) ہیں اور کوئی تیسرا ہمارا امیر ہے' ہم دونوں اُس کے تابع ہیں یا یہ کہ میں امیر ہوں اور یہ مامور ہے' یا یہ کہ وہ امیر ہے' میں مامور ہوں؟ نظم کے اعتبار سے یہ تین مختلف حیثیتیں ہیں' اور ایک انسان ہر معاملے میں' جو بھی اقدام وہ کر رہا ہے یا زبان سے جو بھی لفظ نکال رہا ہے' اُس کا رویہ اگر اِس شعور کے تحت نہیں ہوگا تو سارا نظم تہہ و بالا ہو جائے گا۔ ایک نظم جماعت کے ساتھی ہونے کے اعتبار سے یقیناً سب برابر ہیں' لیکن جب امر قائم ہوا ہے' صاحبِ امر کا نصب ہو گیا ہے' اب وہ امیر ہے اور آپ مامور ہیں۔ جیسے انسان ہونے کے ناتے مَرد و زن یقیناً برابر ہیں۔ شرفِ انسانیت کے اعتبار سے عورت گھٹیا نہیں ہے' لیکن جب ایک مَرد اور ایک عورت کے درمیان رشتۂ ازدواج قائم ہوا ہے تو اِن کے مابین محض مَرد اور عورت کی نسبت نہیں رہی' اب شوہر اور بیوی کی نسبت ہے۔ یہاں قرآنی ہدایت ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ کا اطلاق ہوگا۔ اب معاملہ بالکل بدل گیا' نوعیت تبدیل ہو گئی' نسبت اور ہو گئی۔

اِسی طرح تمام رفقاء آپس میں برابر ہیں' لیکن جب کوئی صاحب امیر بنا دیے گئے تو اب

امیر اور مامور کی جو ایک نسبت قائم ہو جاتی ہے' اِس کا تعین اور پاس ہونا چاہیے۔ اِس کی نمایاں ترین مثال ایک واقعہ ہے جو اِس بات کا مظہر ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ڈسپلن کا کیسا شعور صحابہ کرامؓ میں پیدا کیا تھا۔ یہ واقعہ امام بیہقیؒ نے دلائل النبوۃ کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ سن ۹ ھ میں آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امیر الحج بنا کر قافلہ روانہ فرما دیا۔ قافلہ روانہ ہو چکا تھا کہ سورۃ التوبۃ کی ابتدائی چھ آیات نازل ہوئیں' جن میں تیسری آیت کے الفاظ یہ ہیں: ﴿وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ.....﴾ یعنی حج اکبر کے دن اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف سے یہ اعلان (proclamation) لوگوں کے سامنے کر دیا جائے۔ اعلان یہ تھا کہ مشرکین سے تمام معاہدات ختم کیے جاتے ہیں' اب اُن کے لیے معینہ عرصہ کی مہلت ہے' اسلام قبول کر لیں یا اسلامی حکومت کی سرحدوں سے نکل جائیں' ورنہ اُنہیں قتل کر دیا جائے گا۔ عربوں کے دستور کے مطابق یہ اعلان اُسی صورت میں مؤثر (valid) ہوتا جبکہ آپ ﷺ کا کوئی انتہائی قریبی رشتہ دار یہ اعلان کرتا۔ آپ ﷺ نے اپنے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے حضرت علی ؓ کو بھیجا اور اُن کے ذمے لگایا کہ اجتماعِ حج میں سورۃ التوبۃ کی مذکورہ آیات کو پڑھ کر سنا دیں۔

جب حضرت علی ؓ آئے تو حضرت ابوبکر ؓ نے آگے بڑھ کر اُن کا استقبال کیا اور اُن سے پہلا سوال یہ کیا: ''اَمِيْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ؟'' یعنی مجھے پہلے یہ بتا دیجیے کہ آپ امیر کی حیثیت سے آئے ہیں یا مامور کی حیثیت سے؟ مجھے اپنی حیثیت بھی معلوم ہونی چاہیے اور آپ کی حیثیت بھی۔ اگر نبی اکرم ﷺ نے مجھے معزول کر کے آپ کو امیر بنایا ہے تو میں حاضر ہوں' امارت سنبھالیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو بھی مجھے معلوم ہونا چاہیے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: ''مَاْمُوْرًا'' یعنی میں امیر بنا کر نہیں بھیجا گیا' امیر آپ ہی ہیں' میں مامور بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ صرف ایک خاص کام میرے ذمے لگایا گیا ہے' وہ میں کروں گا۔ یہ ہے نظم اور ڈسپلن کا احساس!

مسند احمد میں روایت ہے کہ حضرت عمر ؓ کے زمانے میں شام کے محاذ پر حضرت خالد بن ولیدؓ کو معزول کر کے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح ؓ کو سپہ سالار بنا دیا گیا۔ حضرت خالدؓ نے یہ نہیں کہا کہ اچھا جی اب مجھے رخصت دیجیے' جو شخص میرے ماتحت رہا ہے میں اُس کے ماتحت رہ کر اب کیسے کام کروں گا؟ یہ ہے اُس تربیت کا نتیجہ جو محمد رسول اللہ ﷺ نے کی تھی۔ ہر فرد کے پیشِ نظر یہی تھا کہ مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے' خواہ امیر کی حیثیت سے ہو یا مامور کی

حیثیت سے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک ایسے معاشرے میں کام کا آغاز کیا جہاں کوئی نظم اور ڈسپلن نہیں تھا۔ آپ ﷺ کے سامنے ایک ایسی قوم تھی جسے قرآنِ حکیم میں "قَوْمًا لُّدًّا" (جھگڑالو قوم) کہا گیا ہے۔ وہاں کوئی کسی کی بات نہ سنتا تھا اور نہ کسی کے سامنے سر جھکانے کو تیار ہوتا تھا۔ اُس قوم میں آپ ﷺ نے ڈسپلن کا یہ احساس پیدا کیا اور رہتی دنیا تک اُن کے نظم کو ایک مثالی نظم کا نمونہ بنا دیا۔

بیعت کی اساس اور سلف صالحین کا طرزِ عمل

اُمت کی پوری تاریخ اِس پر گواہ ہے کہ جو بھی اجتماعی ہیئت وجود میں آئی وہاں بیعت کا نظام اختیار کیا گیا۔ اجتماعیت کی بلند ترین صورت حکومت کا قیام ہے' وہ بھی بیعت کی بنیاد پر قائم ہوتی رہی۔ اِس کی خفی ترین صورت سلسلۂ ارشاد و اصلاح ہے' اِس کے لیے بھی بیعت کا نظام رائج ہے۔ کبھی حکومت کے خلاف بغاوت کی تحریک اٹھی تو وہ بھی بیعت کی بنیاد پر اٹھی۔ چنانچہ اجتماعیت درحقیقت جس شے کا نام ہے وہ اسلام میں بیعت ہی کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔

بلاشبہ اجتماعیت کے قیام کے لیے بیعت کی اساس ماثور ہے' یعنی سلف صالحین سے اِسی اساس کا ثبوت ملتا ہے۔ البتہ یہ اصول طے ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد جس کے ہاتھ پر بھی بیعت کی جائے گی وہ بیعت سمع وطاعت فی المعروف ہوگی۔ یعنی صرف ایسے احکامات میں امیر کی اطاعت کی جائے گی جو قرآن وسنت کی تعلیمات کے خلاف نہ ہوں۔ یہاں تک کہ اگر کسی کو نبی اکرم ﷺ نے بھی امیر مقرر کیا ہو تو اُس کی اطاعت بھی فی المعروف ہوگی۔

صحیح بخاری میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک دستہ کسی مہم پر بھیجا' اُن کے امیر جلالی مزاج کے آدمی تھے' اپنے ساتھیوں سے کسی بات پر ناراض ہو گئے تو اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے اُنہیں بہت بڑا گڑھا کھودنے کا حکم دیا۔ ساتھیوں نے گڑھا کھود دیا۔ اب حکم دیا کہ اِس میں لکڑیاں ڈالو۔ اُنہوں نے لکڑیاں ڈال دیں۔ حکم دیا کہ لکڑیوں کو آگ لگاؤ۔ اُنہوں نے آگ لگا دی۔ یہاں تک تو اطاعت ہو رہی ہے۔ لیکن اِس کے بعد اُنہوں نے حکم دیا کہ اِس آگ میں کود جاؤ! اِس حکم پر عمل کرنے سے ساتھیوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ اِسی آگ سے بچنے کے لیے تو ہم نے محمد رسول اللہ ﷺ کا دامن تھاما تھا' آپ کے حکم پر اِس آگ میں ہم کیسے کود جائیں؟ بعد میں یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اُنہوں نے ٹھیک کیا۔ اگر وہ اُس آگ میں کود جاتے تو پھر آگ ہی میں رہتے۔ یعنی

جہنم میں داخل ہو جاتے۔ آپ ﷺ نے اِس لیے یہ بات فرمائی کیونکہ امیر کا حکم فی المعروف نہیں تھا بلکہ یہ تو خودکشی یعنی منکر کا حکم تھا۔ ایسے حکم کی اجازت کسی صاحبِ امر کو نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا چاہے کوئی آپ ﷺ کا مقرر کردہ امیر ہو' اُس کی اطاعت بھی فی المعروف ہوگی' مطلق نہیں۔ مطلق اطاعت صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نبی اکرم ﷺ بعض اوقات بیعت لیتے ہوئے نرمی کا اظہار فرماتے اور "فِی الْمَعْرُوْف" یا "فِیْ مَا اسْتَطَعْتُمْ" کے الفاظ کا اضافہ فرما دیا کرتے تھے کہ اپنی امکانی حد تک اِس بیعت پر قائم رہو گے۔ البتہ اصولی طور پر محمد ﷺ آخری انسان تھے جن کی اطاعت مطلق تھی' اِن کے بعد کسی کی اطاعت مطلق نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی اطاعت مطلق نہیں ہے تو اور کس کی ہوگی؟

بیعت کے نظم کو اختیار کرنے کے حوالے سے سلف صالحین کے طرزِ عمل کی چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

۱) خلافتِ راشدہ میں چاروں خلفاء کی خلافت بیعت سمع وطاعت کے نظم پر قائم ہوئی۔

۲) دورِ ملوکیت میں حکمران خود کو خلیفہ کہلواتے رہے اور عوام سے بیعت لیتے رہے۔

۳) دورِ ملوکیت میں حکومت کے خلاف تحریکیں بیعت کی اساس پر اُٹھائی گئیں۔ جن اصحاب نے یہ تحریکیں برپا کیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

i) حضرت حسینؓ بن علیؓ ' شہادت ۶۱ ہجری' دورِ بنی اُمیہ

ii) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ' شہادت ۷۳ ہجری' دورِ بنی اُمیہ

iii) حضرت زید بن علی بن حسینؒ ' شہادت ۱۲۱ ہجری' دورِ بنی اُمیہ

vi) حضرت محمد بن عبداللہ (نفس زکیہ) ' شہادت ۱۴۵ ہجری' دورِ بنی عباس

vii) حضرت حسین بن علی' شہادت ۱۷۰ ہجری' دورِ بنی عباس

۴) دورِ ملوکیت میں صوفیاء نے لوگوں کی رُشد واصلاح کے لیے بیعتِ ارشاد کی بنیاد پر تصوف کے سلسلوں کا آغاز کیا۔

۵) دورِ غلامی میں غیر مسلم حکومتوں کے خلاف آزادی اور احیائے اسلام کی تحریکیں بیعت کی اساس پر چلائی گئیں۔ لیبیا میں سنوسی تحریک' سوڈان میں مہدی تحریک' نجد میں وھابی تحریک اور برعظیم پاک وہند میں تحریک شہیدین کی اساس بیعت پر تھی۔

۶) بیسوی صدی عیسوی میں احیائے دین کے لیے جو تحریکیں شروع ہوئیں اُن میں مصر کی

الاخوان المسلمون (امیر حسن البنا شہیدؒ) اور برعظیم پاک و ہند میں حزب اللہ (امیر مولانا ابوالکلام آزاد) کی بنیاد بیعت پر رکھی گئی۔

۱۹۲۰ء میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے تجویز پیش کی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند مان کر اُن کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی جائے لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اِس تجویز پر عمل نہ ہو سکا۔

دسمبر ۱۹۹۴ء میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب کی کتاب ''علامہ اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین'' شائع ہوئی۔ اِس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے انکشاف کیا اور شواہد پیش کیے کہ علامہ اقبال بھی اپنی زندگی کے آخری دور میں جمعیت شبان المسلمین کے نام سے ایک جماعت بنانا چاہتے تھے جس کی اساس بیعت کے اصول پر قائم کرنے کا ارادہ تھا اور جس کا مقصد دینِ اسلام کا احیاء تھا۔

(ملاحظہ فرمایئے علامہ اقبال کی آخری خواہش، مؤلف: حافظ عاکف سعید)

حرفِ آخر:

دنیا میں کوئی نظام یا ادارہ چل ہی نہیں سکتا جب تک کہ اُس میں کوئی ایک ایسا عہدیدار یا کاڈر (cadre) موجود نہ ہو جس کا فیصلہ حتمی یا حرفِ آخر ہو۔ ایک ادارے میں ڈائریکٹرز کئی ہو سکتے ہیں لیکن مینیجنگ ڈائریکٹر ایک ہی ہوتا ہے۔ پھر کسی بھی اجتماعیت کے نظم کا تعلق اُس کے کام اور ہدف سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی اجتماعیت محض خدمتِ خلق، تبلیغ، تدریس، نشر و اشاعت وغیرہ کے لیے بنی ہے اور جس میں کسی قوت سے عملی ٹکراؤ کی نوبت آنے کا امکان نہیں، وہاں ڈھیلا ڈھالا نظم بھی چل سکتا ہے۔ البتہ جہاں معاملہ انقلابی نوعیت کا یعنی نظام کی تبدیلی کا ہو اور کسی دشمن سے ٹکراؤ کا اندیشہ بھی ہو وہاں تو سمع و طاعت ہی کا نظم نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آرمی ڈسپلن کے لیے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں:

Their's Not to Reason Why?
Their's But to Do and Die!

دنیا میں آج تک جتنے بھی اہم اور قابلِ ذکر کام ہوئے اُن کے پیچھے کسی ایک ہی شخصیت کی رہنمائی و قیادت اور ساتھیوں کی طرف سے اُس کی دل و جان سے اطاعت ہمیں نظر آتی ہے۔ بقول مولانا مودودیؒ:

''کوئی تحریک اِس کے بغیر نہیں چل سکتی کہ اُس کو ایک شخصیت لے کر چلے جسے تحریک

کے اندر بھی دلوں اور دماغوں پر غیر معمولی اثر حاصل ہو اور تحریک کے گرد و پیش عام پبلک میں بھی اُس کے اثرات پھیلتے چلے جائیں۔ دینی تحریک ہو یا دنیوی ایک شخصیت کے بغیر اِس کا کام نہیں چلتا۔ اللہ تعالیٰ نے خود اسلامی تحریک کے لیے انبیاء کی شخصیتیں سامنے لاکر رکھ دیں اور اُن کا غیر معمولی وزن اپنی مشیت ہی سے نہیں اپنے احکام سے بھی قائم کیا۔ انبیاء کے بعد جب اور جہاں بھی کوئی دینی تحریک اُٹھی ہے ایک شخصیت کے بل پر اُٹھی ہے اور بڑی بڑی شخصیتوں نے کسی دنیوی غرض کے لیے نہیں بلکہ خدا کے دین کی خاطر یہ ایثار کیا ہے کہ اپنا سارا وزن اُس کے وزن میں شامل کر کے اُس کا وزن بڑھایا اور گرد و پیش کی دنیا میں اِس کا اثر قائم کیا"۔ (۹)

اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ ہم میں سے ہر فرد کو یہ شعور عطا فرمائے کہ مجھے اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے غلبۂ دین کی جدوجہد کرنی ہے۔ اِس جدوجہد کے لیے اجتماعیت سے جڑنا اور فعال کردار ادا کرنا لازم ہے۔ اب خواہ میں امیر کی حیثیت میں ہوں یا مامور کی، مجھے نظم کی پابندی کرنی ہے۔ مجھے جو حکم ملے گا میں اُس کو بجالانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ میں اجتماعیت میں کسی پر احسان کرنے نہیں بلکہ اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے شامل ہوا ہوں۔ اللہ مجھے توفیق دے کہ میں نظم کے تقاضے پورے کرتے ہوئے زندگی کے آخری سانس تک اُس کی راہ میں خلوص کے ساتھ اپنا مال و جان لگاتا رہوں۔ آمین!

حواشی

(۱) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین عند ظھور الفتن۔

(۲) سنن الترمذی، کتاب الامثال عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ۔ ومسند احمد، کتاب مسند الشامیین، باب حدیث الحارث الاشعری عن النبی ﷺ۔

(۳) صحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔

(٤) صحیح البخاری، کتاب الجھاد والسیر، باب یقاتل من وراء الامام ویتقی بہ۔ وصحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ۔

(٥) سنن الترمذی، کتاب الجھاد، ترجمۃ الباب۔ مشکاۃ المصابیح، کتاب الامارۃ والقضاء، الفصل الثانی، بحوالہ شرح السُّنّۃ۔ راوی: النوّاس بن سمعان ؓ۔

(٦) سنن الدارمی، المقدمۃ، باب فی ذھاب العلم۔

(۷) صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب کیف یبایع الامام الناس۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ.....

(۸) صحیح البخاری' کتاب الجھاد والسیر' باب التحریض علی القتال۔

(۹) اقتباس از تحریک جماعتِ اسلامی کا ایک گمشدہ باب 'صفحہ ۳۱۶' مؤلف: ڈاکٹر اسرار احمد

بقیہ: عرضِ احوال

کا حکم کیا دیتی اور منکر کے راستے کا پتھر کیا بنتی' اس کا اپنا حال یہ ہے کہ ستاون اسلامی ممالک میں سے ایک ملک بھی ایسا نہیں ہے کہ اُسے صحیح معنوں میں اسلامی فلاحی ریاست کہا جا سکتا ہو' جہاں ہر کام سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہو کہ اللہ کا حکم کیا ہے' پیارے نبیؐ کی سنت کیا ہے!

آخرت میں سرخرو ہونے کے لیے اور دنیا میں عزت و وقار کا مقام حاصل کرنے کے لیے ہمیں سیرتِ نبوی سے روشنی حاصل کرنی ہو گی اور صحابہؓ کے کردار کا جائزہ لینا ہو گا۔ صحابہ کرامؓ آپ کے یوم پیدائش پر جشن تو نہیں مناتے تھے' لیکن جہاں حضورﷺ کا پسینہ گرتا تھا وہاں صحابہؓ کا خون گرتا تھا۔ آپؐ کے اشارۂ ابرو پر جان کی بازی لگانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مکہ کی بے آب و گیاہ زمین کے یہ مکین قیصر و کسریٰ پر حاوی ہو گئے۔ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار پکڑ کر وہ بحر و بر کو روندتے چلے گئے۔ صحرا' جنگل اور پہاڑ کوئی ان کے راستے میں حائل نہ ہو سکا' حالانکہ ہماری طرح اُن کے بھی دو ہاتھ دو پاؤں تھے' لیکن اُن کے قلوب قرآن کی دولت سے مزین تھے' اُن کے سامنے نبی مکرمﷺ کی سیرت تھی اور سنتِ رسولؐ اُن کا ہتھیار تھا۔ آج بھی ہمارے مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ ہم اپنے قول و فعل کا تضاد دور کریں۔ ہماری زبانیں اگر حضورﷺ کی نعت سے تر ہوں تو ہمارے افعال ارشادِ نبویؐ کے مطابق ہوں۔ ہم سنتِ رسولؐ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیں اور صرف ماہ ربیع الاوّل ہی نہیں ہر دن ہر شب کی نسبت حضورﷺ سے جوڑ دیں۔ کسی صورت اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہو اور کبھی سنتِ رسولؐ کا دامن ہمارے ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ ہماری زندگیاں اس بات کی گواہ ہوں کہ ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!!

❁❁❁

نماز اور ترکِ مُنکرات

حافظ محمد مشتاق ربانی

حضرت شعیب علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو توحید کا درس دیا اور ماپ تول میں کمی کرنے سے منع کیا تو وہ لوگ سوچ میں پڑ گئے کہ حضرت شعیبؑ کی زندگی میں ایسا کونسا عمل ہے جو انہیں نیکی پھیلانے اور برائی سے منع کرنے پر اُکساتا ہے۔ پھر وہ سمجھ گئے کہ یہ جو دن میں بار بار نماز ادا کرتے رہتے ہیں یہی عمل انہیں ہمیں سمجھانے پر مجبور کرتا ہے۔

نماز کوئی ایسی عبادت نہیں جو صرف اُمتِ مسلمہ ہی پر فرض کی گئی ہو بلکہ یہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی زندگیوں میں نظر آتی ہے۔ جیسا کہ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

لم يبعث الله نبيا الا فرض عليه الصلوٰة والزكوٰة (۱)

''اللہ تعالیٰ نے ہر نبی پر نماز اور زکوٰۃ فرض کی''۔

گویا نماز دینِ قیم (وہ دین جو سب انبیاء کرام علیہم السلام کے ہاں مشترک تھا) کا ایک جزو ہے جیسا کہ سورۃ البینہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝۵﴾ (البینۃ)

''اور ان (یعنی اہل کتاب) کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی سچا دین ہے۔''

سورۃ الانبیاء میں فرمایا:

﴿وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ﴾ (الانبیاء:۷۳)

''اور ہم نے ان کو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے راہنمائی کرتے تھے اور ہم نے انہیں

وحی کے ذریعہ نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ہدایت کی۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی:

﴿رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ.....﴾ (ابراھیم:۳۷)

"پروردگار! میں نے ایک بے آب وگیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار! یہ میں نے اس لیے کیا کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں....."

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿وَكَانَ یَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۪﴾ (مریم:۵۵)

"وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔"

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نماز ادا کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ.....﴾ (لقمٰن:۱۷)

"اے میرے بیٹے! نماز قائم کر....."

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے بنی اسرائیل سے کہا گیا:

﴿وَاجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ﴾ (یونس:۸۷)

"(اگر تمہیں اعلانیہ نماز پڑھنے سے روکا جا رہا ہے تو) اپنے گھروں کو قبلہ (یعنی مسجدیں) ٹھہراؤ اور نماز قائم کرو۔"

حضرت زکریا علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ.....﴾ (آل عمران:۳۹)

"وہ ابھی عبادت گاہ میں کھڑے نماز ہی پڑھ رہے تھے کہ فرشتوں نے آواز دی....."

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴿۳۱﴾﴾ (مریم)

"اور جب تک میں زندہ ہوں مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے۔"

حضرت شعیب علیہ السلام کی نماز کے بارے میں ان کی قوم نے جو ریمارکس دیئے اس کا تذکرہ قرآن حکیم میں یوں آیا ہے:

﴿قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا﴾ (ھود:۸۷)

''انہوں نے کہا اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں ہم ان کو ترک کر دیں یا اپنے مال میں تصرف کرنا چاہیں تو نہ کریں؟''

حضرت شعیب علیہ السلام کی نماز کا پوری قوم میں بہت چرچا تھا۔ وہ اکثر نوافل میں مشغول رہتے تھے۔ اس لیے ان کی قوم نے ان کے ارشادات وتعلیمات کو بطورِ استہزاء وتمسخر ان کی نماز کی طرف منسوب کر دیا کہ کیا تمہاری نماز تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ تم ہمارے معاملات میں بے جا مداخلت کرو' ہماری تہذیب کو برا بھلا کہو' ہمارے آباء واَجداد کے معبودوں کی مخالفت کرو' ان کی عبادت سے ہمیں باز رکھو اور صرف ایک اللہ کی عبادت کرنے کی ہمیں ترغیب دو؟ یہ تمہاری نماز ہی ہے جو تمہیں ہمارے اموال میں دخل اندازی کرنے پر اکساتی ہے۔ کیا تمہاری نماز کا یہ سبق ہے کہ ہم اپنی ہی دولت کو اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے کی بجائے تمہارے خود ساختہ اصولوں کے مطابق خرچ کریں؟ حالانکہ ہمارا مال ہے اور ہمیں ہی حق ہونا چاہیے کہ ہم جس طرح چاہیں اسے کمائیں اور خرچ کریں۔ ہمیں اپنا مال کمانے اور خرچ کرنے میں کسی کی راہنمائی کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ سے اسی آیت ﴿قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ﴾ کے بارے میں کسی نے پوچھا کہ اس سے کیا مراد ہے' تو سفیانؒ نے جواب دیا:

ای واللہ تامُرُہ وتنھاہ (۲)

''اللہ کی قسم' نماز حکم بھی دیتی ہے اور منع بھی کرتی ہے۔''

یہی بات قرآن حکیم میں بایں طور بیان ہوئی ہے:

﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (العنکبوت:٤٥)

''یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے۔''

اسی کے ضمن میں تفسیر المظہری میں روایت ہے:

عَنْ اَنَسٍ ؓ قال: کان فتی من الانصار یصلّی الصّلوات الخمس مع رسول اللہ ﷺ لم یدع شیئًا من الفواحش الا رکبه فوُصِفَ لرسول اللہ ﷺ حالہ فقال رسول اللہ ﷺ ((ان صلاتہ تنھاہ یومًا)) فلم

یلبث ان تاب و حسُن حاله)) (۳)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک انصاری نوجوان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پنج وقتہ نماز ادا کرتا تھا لیکن وہ گناہ سے باز بھی نہ آتا تھا۔ اس کی رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی گئی تو آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''اس کی نماز ایک نہ ایک دن اسے برائیوں سے روک دے گی۔ چنانچہ چند دن ہی گزرے کہ اس کی حالت یکسر بدل گئی اور اس نے تمام گناہوں سے سچے دل سے توبہ کر لی۔''

ایک اور روایت ہے:

عن جابر رضی اللہ عنہ قال قال رجلٌ للنبی ﷺ انّ رجلا یقرأ القرآن باللیل کلّه فاذا اصبح سرق قال :((ستنهی قراء ته)) (۴)

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صاحب نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: ایک شخص ساری رات قرآن کی تلاوت کرتا ہے' لیکن جب صبح ہوتی ہے تو چوری کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''عنقریب اس کی تلاوت اسے روک دے گی۔''

سوال یہ ہے کہ نماز میں ایسی کون سی خاصیت ہے جو نماز پڑھنے والوں کو برائیوں سے روکتی ہے۔ اس ضمن میں ابوالعالیہ کا قول ہے:

ان الصلوة فیها ثلاث خصالٍ' فکل صلوةٍ لا یکون فیها شیء من هذه الخصال فلیست بصلٰوة: الاخلاصُ والخشیةُ وذکرُ اللّٰه' فالاخلاصُ یأمره بالمعروف والخشیة تنهاه عن المنکر وذکر اللّٰه القرآن یامره وینهاه (۵)

''نماز میں تین خصلتیں ہیں۔ ان میں سے اگر کوئی خصلت بھی کسی نماز میں نہ ہو تو وہ نماز ہی نہیں ہے۔ وہ خصلتیں یہ ہیں: خلوص' اللہ تعالیٰ کا خوف اور یادِ الٰہی۔ خلوص کا فعل یہ ہے کہ نماز پڑھنے والے کو نیک کام کا حکم دیتا ہے' اللہ تعالیٰ کا خوف اسے بدی سے روکتا ہے اور یادِ الٰہی قرآن ہے' جو اسے حکم بھی دیتا ہے اور روکتا بھی ہے۔''

بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ نماز میں اتنی بڑی خاصیت کا ہونا کہ وہ برائیوں سے روکتی ہے' مشاہدہ کے خلاف ہے۔ ان کا مشاہدہ ہے کہ بہت سے نمازی حضرات جن کی ایک وقت کی نماز بھی قضا نہیں ہوتی ایسے بُرے بُرے افعال و حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں کہ نماز نہ پڑھنے والے افراد بھی ایسے افعال نہیں کرتے۔ اس شبہ کے ازالے کے لیے مولانا عبدالشکور لکھنوی

لکھتے ہیں:

''اس شبہ کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ کسی مضمون کو اس تصریح کے ساتھ قرآن مجید میں دیکھ کر مشاہدہ یا مشاہدہ سے بڑھ کر کسی چیز کی وجہ سے اس پر شبہ کرنا بے ایمانی کی علامت ہے۔ اگر آج کسی ڈاکٹر یا کسی طبیب کی زبان سے کسی دوا کی کوئی خاصیت سنی جاتی ہے اور کوئی شخص اس دوا کا استعمال کرتا ہے اور وہ خاصیت ظاہر نہیں ہوتی تو خود اس شخص کا دل ہزاروں توجیہات تراشتا ہے کہ شاید دوا کے استعمال میں کوئی بے قاعدگی ہوگئی ہو' شاید مقدارِ شُرب میں کچھ تفاوت ہوگیا ہو' شاید کوئی مادۂ فاسد بدن میں موجود تھا اس نے خاصیت ظاہر نہ ہونے دی' شاید کچھ بد پرہیزی ہوگئی' وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ یہ خیال بھی آسان تھا کہ طبیب کا علم ناقص ہو' اُس نے غلطی سے وہ خاصیت بیان کردی ہو۔ یہ احتمال بھی صحیح تھا کہ طب کا علم ظنی ہے اور ظن میں خطا کی گنجائش ہے' مگر یہ خیال و احتمال دل میں آتا ہی نہیں۔ پھر انصاف تو کرو کہ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم جس کی حکمت تک خطا کی رسائی نہیں' اس کی بیان کی ہوئی خاصیت پر اس طرح بلا تامل شبہ کر دینا بے ایمانی نہیں تو اور کیا ہے؟

دوسرا تحقیقی جواب یہ ہے کہ مشاہدہ کا حوالہ دینا ہی غلط ہے۔ جن نماز پڑھنے والوں کی بابت یہ کہا گیا کہ وہ بُرے افعال میں منہمک رہتے ہیں وہ نماز نہیں پڑھتے بلکہ نماز کی نقل اتارتے ہیں۔ اور کاش وہ نقل بھی کامل ہوتی تو خالی از اثر نہ ہوتی''۔ (۲)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی کی نماز اسے برائیوں اور فحش کاموں سے نہیں روک رہی تو کیا اسے نماز ترک کر دینی چاہیے؟ ہرگز نہیں! نماز تو ہر حالت میں ادا کرتے ہی رہنا چاہیے' خواہ وہ نماز فحش اور برائیوں سے روکنے والی نہ بھی ہو' کیونکہ نماز ادا کرنے سے کم از کم ایک فرض کی ادائیگی تو ہو رہی ہے۔ البتہ اس کے ساتھ ساتھ اصلاحِ احوال کی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مکتوب میں اس بارے میں فرماتے ہیں:

''جو نماز ایسی نہیں ہے (یعنی جو برائیوں سے روکنے والی نہیں ہے) وہ نماز کی صرف صورت ہے (نماز کی) حقیقت نہیں ہے' لیکن حقیقت نماز کے حاصل ہونے تک صورت کو بھی نہ چھوڑنا چاہیے' ''ما لا یدرك کله لا یترك کله'' جو چیز پوری حاصل نہ ہو سکے اس کو بالکل ترک بھی نہیں کرنا چاہیے' یعنی جس قدر مل سکے حاصل کر لے۔ اکرم الاکرمین (حق سبحانہ وتعالیٰ) اگر نماز کی صورت کو نماز کی حقیقت کے درجہ میں اعتبار

کرے تو کچھ بعید نہیں"۔ (۷)

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سوچیں کہ ہم نماز میں کس جگہ کوتاہی کر رہے ہیں کہ آج ہماری نماز بے روح ہے۔ نماز تو ایسی ہونی چاہیے جو قلب میں طہارت پیدا کرے' روح کو تازگی بخشے' خیالات میں مثبت تبدیلی پیدا کرے' بے حیائی اور برے کاموں سے منع کرے' بلکہ نمازی کے اندر ایسا انقلاب پیدا کرے کہ وہ دوسروں کی اصلاح کرنے کے لیے تیار ہو جائے' جیسا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی نماز دوسروں کی اصلاح کے لیے انہیں آمادہ کرتی تھی۔

آخر میں اس مغالطے کا ازالہ ضروری ہے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ نماز کو پورے اوصاف و شرائط کے ساتھ ادا کرنے سے انسان معصوم بن جاتا ہے' پھر اس سے کوئی گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسا ہرگز نہیں' بلکہ نماز کے فحش اور بُرے کاموں سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ نماز سے انسان نیکی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور گناہ سے اسے گھن آنے لگتی ہے۔ ایسے انسان سے اگر بحیثیت بشر کوئی گناہ صادر ہو جائے تو اسے فوراً ندامت و شرمندگی ہوتی ہے اور وہ توبہ و استغفار کر لیتا ہے۔

حواشی

(۱) القرطبی' الجامع لاحکام القرآن' ج۵' ص ۵۸۔

(۲) مولانا ابوالکلام آزاد' ارکان اسلام' ص ۱۲۷۔

(۳) قاضی ثناء اللّٰہ پانی پتی' تفسیر المظھری (علی ھامش العنکبوت) ج۷' ص ۲۱۲۔

(٤) قاضی ثناء اللّٰہ پانی پتی' تفسیر المظھری (علی ھامش العنکبوت) ج۷' ص ۲۱۳۔

(٥) ابن کثیر' تفسیر القرآن العظیم' ج۷' ص ۲۹٦۔

(٦) محمد عبدالشکور لکھنوی' کتاب الصلٰوۃ' ص ٤٦۔

(۷) سید زوار حسین شاہ (مترجم) مکتوبات محدد الف ثانی (دفتر اوّل' مکتوب ۸۵)' ص ۲۵۰'۲۵۱۔

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

اساطینِ علم کے
اربابِ اقتدار سے تعلقات (۲)

حافظ طاہر اسلام عسکری

⊙ امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ

ابوعمران ابراہیم بن یزید النخعیؒ عراق کے عظیم مجتہد، فقیہہ اور مفتی تھے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے شیخ امام حماد بن ابی سلیمان کو امام نخعیؒ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ امام شعبیؒ نے ان کی وفات پر فرمایا کہ ''اس عالم میں دنیا سے رخصت ہوئے ہیں کہ اپنا مثل دنیا میں نہیں چھوڑا''۔

امام موصوف اربابِ حل وعقد کے قریب ہونے کو انتہائی معیوب خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ابن ابی لیلیٰؒ امام نخعیؒ کے ہاں اس بنا پر قابلِ جرح ہیں کہ وہ ''صاحبِ امراء'' تھے، یعنی اصحابِ سلطنت کے قریب رہتے تھے۔

⊙ امام اعظم ابوحنیفہ النعمان رحمۃ اللہ علیہ

ان علمائے ربانی کی فہرست خاصی طویل اور واقعات لاتعداد ہیں جنہوں نے اعلیٰ مناصب اور عہدوں کی پُرکشش حکومتی پیشکشوں کو پاؤں کی ٹھوکر پہ رکھا اور کسی جابر ومستبد حاکم کے جور وتشدد کی مطلق پروانہ کی۔ ان تمام نفوسِ قدسیہ کا تذکرہ زیرِ نظر مضمون میں ممکن ہے نہ اس کا یہ محل ہے، لیکن ایک عظیم شخصیت کا ذکر اس باب میں بہرآئینہ ناگزیر ہے کہ اربابِ اقتدار سے عدم تعلق اور کنارہ کشی کے سلسلہ میں اب تک جن اساطینِ علم کے احوال بیان ہوئے ہیں انہوں نے اگرچہ بے نظیر شجاعت واستقامت کا مظاہرہ کیا، لیکن اس راہِ جنوں میں جان لٹانے کی سعادت حاصل نہ کر سکے۔ یہ اعزاز محض اسی ہستی کو سزاوار تھا، دنیا جسے امامِ اعظم کے لقب سے جانتی ہے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

حضرت الامام نے دو مرتبہ عہدۂ قضا کی حکومتی پیشکش کو مسترد کیا' جس کی پاداش میں نہ صرف بدترین تشدد برداشت کیا اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں' بلکہ اسی جرمِ انکار کی سزا میں زنداں ہی سے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور یوں تاریخ عزم و استقلال میں ایک درخشندہ باب کا اضافہ ہو گیا۔

☆ اُموی دور میں امام اعظمؒ پر تشدّد

◆ بنواُمیّہ کے آخری خلیفہ مروان کی جانب سے مقرر کردہ گورنر کوفہ کو عہدۂ قضا کے لیے ایک موزوں شخص کی تلاش تھی۔ اُس نے امام اعظم کی فقاہت اور علمی پختگی سے متاثر ہو کر انہیں قاضی کا منصب قبول کرنے کی درخواست کی' لیکن حضرت الامام نے معذرت کر لی کہ ''میں یہ ذمہ داری سرانجام نہیں دے سکتا''۔

ابن ہبیرہ (گورنر کوفہ) کا اصرار بڑھتا گیا مگر امامِ والا مقام اپنے انکار پر قائم رہے۔ آخر کار کہا گیا کہ آپ کو جبراً جج بننا پڑے گا۔ فرمایا: ''جبر و اکراہ کی کوئی صورت بھی مجھے اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتی''۔ اربابِ سلطنت کو بھلا یہ توہین و گستاخی کب گوارا ہو سکتی تھی' لہٰذا عبرت ناک سزا دینے کا فیصلہ ہوا اور ابن ہبیرہ نے حکم صادر کیا کہ ''اس گستاخ کو لے جاؤ اور مجمع عام میں دس کوڑے اس طرح لگاؤ کہ ہر کوڑے سے پہلے قاضی کا عہدہ پیش کرو' جب انکار کرے پھر کوڑا لگاؤ اور پورے دس روز ایسی ہی ذلت آمیز سزا جاری رکھو''۔ امام صاحب مسلسل دس دن بخوشی یہ انتہائی دردناک اور توہین آمیز سزا قبول کرتے ہوئے فرماتے رہے کہ دنیا کی سختیاں اور مصائب و آلام منظور مگر خدا تعالیٰ کی ناراضی اور غضب گوارا نہیں۔

ابن ہبیرہ اور اس کے ظالم کارندوں کو ایک عشرہ گزرنے پر جب یہ یقین ہو گیا کہ حضرت الامام سے عہدۂ قضا منوانا بمصداق ''ایں خیال است و محال است و جنوں'' ہے تو ندامت و شرمندگی کے ساتھ امام صاحب کو واگزار کر دیا۔ (۳۳)

☆ عباسی عہدِ خلافت میں امام صاحب کی آزمائش

جور و ستم کا ایک دور ختم ہوا' اُموی حکومت اپنے انجام کو پہنچی اور ظلم و تشدد ہی کی بنیاد پر خلافتِ عباسیہ کا آغاز ہوا۔ فی زمانہ تو حکومتوں کی تبدیلی سے بھی ''علماء حضرات'' فائدہ اٹھاتے

ہیں اور نیا برسرِ اقتدار آنے والا خواہ مستبد آمر ہو یا بدعنوان ترین جمہوریت پسند' یہ اقتدار و اختیار سے اپنا حصہ بقدرِ جُثہ لینے سے نہیں چوکتے' مگر زمانہ سلف میں حالت مختلف تھی۔ وہاں ''چہروں کی تبدیلی'' سے فرق نہیں پڑتا تھا' بلکہ اس نظامِ ظلم سے بغاوت و نفرت تھی' خواہ وہ ''اُمویت'' کے لبادے میں ہو یا ''عباسیت'' روپ میں۔

عباسی فرمانروا ابوجعفر منصور مسندِ خلافت پر متمکن ہوا تو مخالفین کا جابرانہ ہتھکنڈوں سے استیصال شروع کیا۔ اس ضمن میں اس نے نامور اور ممتاز علماء کو' جن کا عوام پر گہرا اثر و رسوخ تھا' بھی زیر کرنے کا سوچا اور عہدوں کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ ان اہل علم میں امام اعظمؒ سرفہرست تھے۔ منصور نے امام صاحب سے گزارش کی: ''مجھے آپ جیسے ذی فہم و نکتہ رس قاضی کی اشد ضرورت ہے' لہٰذا براہِ نوازش میری درخواست قبول فرمایئے''۔

حضرت الامام نے فرمایا: ''میں تو عہدۂ قضا کے قابل ہی نہیں''۔

منصور کہنے لگا: ''یہ صریح جھوٹ ہے''۔

فرمایا: ''پھر تو میں ہرگز قاضی بننے کے لائق نہیں رہا' کیونکہ جھوٹے کو منصبِ منصفی پر فائز کرنا عقلاً جائز ہے نہ شرعاً''۔

لیکن منصور مصر رہا کہ وہ بہرحال آپ کو جج دیکھنا چاہتا ہے۔ امام صاحب بھی اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ آخر دربارِ خلافت سے فرمان جاری ہوا کہ حضرت الامام کو جیل بھیج دیا جائے اور اگر عہدہ قبول نہ کریں تو انہیں کسی طور رہا نہ کیا جائے۔ یہ ۱۴۶ھ تھا' ۱۵۰ھ تک منصور اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا رہا۔ جب ناکام و نامراد ہو گیا تو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر امام صاحب کو بے خبری میں زہر دلوا دیا۔ زہر کا اثر ہوا اور آپ کی شہادت یقینی ہو گئی تو دوگانہ شکر ادا کیا کہ مولا کریم' جیسے تو نے مجھے اپنے فضل سے راہِ حق میں مشکلات و مصائب برداشت کرنے کی توفیق بخشی ہے' ویسے ان کو قبول بھی فرمایئے۔ غرضیکہ منصور کی قید سے آپ اُس وقت رہا ہوئے جب روح جسم کی قید سے آزاد ہوئی۔ اُس وقت آپؒ کی عمر ستّر سال تھی۔(۳۴)

یہاں تک تو تذکرہ تھا اُن اہلِ علم کا جو اصحابِ سلطنت سے تعلقات استوار کرنے' ان سے عطیات قبول کرنے اور حکومتی عہدوں پر فائز ہونے کو ناپسند گردانتے تھے۔ لیکن بعض علماء کی رائے اور طرزِ عمل اس سے مختلف ہے' جس کی تفصیل ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر

مسئلہ زیر بحث میں دوسرا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ بعض شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اربابِ اقتدار سے میل جول اور ان سے عطیات لینے میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ درست ہے۔ چنانچہ ابن شہاب زہری' اوزاعی' ابن ابی لیلیٰ' شعبی' قبیصہ بن ذویب' حسن بصری' ابوالزناد' مالک بن انس اور شافعی رحمہم اللہ جیسے عظیم المرتبت بزرگوں کا یہی موقف ہے۔ ان کے نزدیک اس باب میں شرائط ذیل کو ملحوظ و مدنظر رکھنا ناگزیر ہے:

(۱) وہ حاکم شریعتِ الٰہی کے مطابق فیصلے کرتا ہو۔

(۲) حکمران عدل و فضل سے متصف ہو۔

(۳) صاحبِ اقتدار' اصحابِ علم کی ملاقات اور ان کی آمد کا متمنی اور آرزومند ہو۔

(۴) جب حاکم کو اس کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر متنبہ کیا جائے تو وہ اسے قبول کرے۔

(۵) اربابِ حل وعقد کے پاس جانے والا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا التزام کرے۔

(۶) کمزوروں کی سفارش کرے اور جو اپنی آواز ایوانِ اقتدار تک پہنچانے سے قاصر ہیں' ان کی حاجات وضروریات سے حکمران کو آگاہ کرے۔

(۷) وہ کوشش کرے کہ حکام اور بدکردار وغلط کار مشیروں کے درمیان حائل ہو جائے تاکہ وہ ان کے غلط اور عاقبت نااندیشانہ مشوروں سے محفوظ رہ سکیں۔

ان حضرات کا کہنا ہے کہ ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے اہل اقتدار سے میل جول رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ رہا ان آثار واحادیث کا معاملہ' جن سے مانعین کا استدلال ہے تو انہیں ظالم وجابر اور فاسق وفاجر حکمرانوں سے تعلقات کی ممانعت پر محمول کیا جائے گا۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کچھ لوگوں کو دیکھا تو دریافت کیا کہ کہاں سے آ رہے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ امیر مروان کے ہاں سے۔ آپ نے استفسار کیا کہ کیا تم اس کی حق سچ باتوں کی تصدیق اور اس پر اس کی مدد واعانت کرتے ہو اور اس کی ہر غلط بات پر اسے ٹوکتے یا اس کی تردید کرتے ہو؟ وہ کہنے لگے: نہیں' ہماری صورت حال تو یہ ہے کہ وہ غلط بات کہتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ آپ نے درست اور سچ فرمایا اور باہر آ کر کہتے ہیں کہ خدا اسے غارت کرے' یہ کس قدر ظالم اور بدکردار ہے۔ یہ سن کر ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ''ہم عہدِ رسالت میں اسے نفاق سمجھتے تھے''۔ (۳۵)

بہرآئینہ مندرجہ بالا شرائط کا خیال رکھا جائے تو اصحابِ سلطنت کے پاس جانا درست معلوم ہوتا ہے' تاہم ان سے دور رہنا ہی بہتر و افضل ہے کہ اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہونے والا بہرحال سنگین خطرے سے دوچار رہتا ہے اور مذکورہ بالا شرائط کی عدم موجودگی میں تو ان سے میل ملاقات کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو گنہگار ہوگا۔ جن علمائے سلف نے جواز کا مسلک اختیار کیا ہے وہ حکمرانوں سے اپنے شخصی یا مادی مفادات کی خاطر تعلقات نہیں رکھتے تھے بلکہ اصلاحِ احوال ان کا مقصود ہوتا تھا۔ وہ مندرجہ بالا تمام امور کو سختی سے مدنظر رکھتے تھے اور حکمرانوں کے غلط اقدامات پر علی الاعلان ان کی سرزنش کرتے تھے' جیسا کہ آئندہ آنے والی سطور میں بیان کردہ کچھ واقعات سے واضح ہوگا۔

حافظ المغرب علامہ ابن عبدالبرؒ حکام سے عدم تعلق اور ان سے مجتنب رہنے سے متعلقہ احادیث و آثار بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''اس باب میں جن بادشاہوں کا ذکر ہے وہ ظالم و فاسق بادشاہ ہیں نہ کہ عادل و متقی حکام' کیونکہ عادل و نیک حاکموں سے ارتباط و تعاون افضل ترین عمل ہے۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے دربار میں کیسے کیسے جلیل القدر علماء و فضلاء' اخیار و ابرار موجود رہتے تھے' مثلاً عروہ بن الزبیر' امام زہری اور ان کے طبقے کے لوگ۔ اسی طرح شعبی' ابن ذویب' رجاء بن حیات' حسن بصری' ابوالزناد' امام مالک' اوزاعی' امام شافعی وغیرہ حکام کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے۔ اصل اس باب میں یہ ہے کہ عالم ضرورت ہی سے ایسی جگہ جائے اور نصیحت و ہدایت کا پیام پہنچادے' لیکن واقعہ یہی ہے کہ یہ گھر فتنہ کا گھر ہے اور اس سے دور رہنے ہی میں سلامتی ہے''۔ (۳۶)

امام ابن مفلحؒ حدیث مبارکہ ((مَنْ اَتٰی اَبْوَابَ السُّلْطَانِ افْتُتِنَ)) کی شرح میں رقم طراز ہیں کہ:

''یہ حدیث اس صورت میں محمول ہے کہ صاحبِ حکومت سے ملاقات طلبِ دنیا کی خاطر ہو یا یہ کہ وہ ظالم و جابر ہو۔ یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ اسے معمول ہی نہ بنالیا جائے کہ ایسی صورت میں فتنے کا اندیشہ ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: ((وَمَنْ لَزِمَ السُّلْطَانَ افْتُتِنَ)) یعنی جو سلطان سے مسلسل وابستگی اختیار کرلیتا ہے وہ آزمائش اور فتنے کا شکار ہوجاتا ہے''۔ (۳۷)

اہلِ علم کی اصحابِ اقتدار کو نصیحتیں

اب ان علماء کے چند واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن کا حکمرانوں کے ہاں آنا جانا رہتا تھا۔ ان سے معلوم ہوگا کہ وہ انہیں کس قدر قیمتی نصائح فرماتے تھے اور اقتدار کے ایوانوں میں ان کی یہ آمد و رفت حقیر دُنیوی منافع کی بنا پر نہ تھی بلکہ محض دینی و ملی مصالح ہی ان کے پیش نظر تھے۔

⊙ عطاء بن ابی رباح کی عبدالملک بن مروان کو نصیحت

اصمعی کا بیان ہے کہ عبدالملک اپنے عہدِ خلافت میں حج کے لیے مکہ مکرمہ آیا ہوا تھا۔ حضرت عطاء رحمہ اللہ اس کے پاس گئے۔ وہ اس وقت تخت پر جلوہ افروز تھا اور اس کے اردگرد اشراف و معززین نشست رکھے ہوئے تھے۔ جب عبدالملک نے امام عطاءؒ کو دیکھا تو اٹھ کر آگے بڑھا اور انہیں سلام کیا۔ پھر انہیں اپنے تخت پر بٹھایا اور خود ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ بعد ازاں امام صاحب سے کہنے لگا: ''ابومحمد! اپنی کوئی ضرورت بیان فرمائیے''۔ حضرت عطاءؒ نے فرمایا:

''امیر المؤمنین! حرمِ خداوندی اور حرمِ نبویؐ کے باب میں خدا سے ڈریے اور ان کی عمارت و آبادی کے حوالے سے اپنی ذمہ داری ادا کیجیے۔ مہاجرین و انصار کی اولاد اور بال بچوں کے حوالے سے بھی احکاماتِ الٰہی کا لحاظ رکھیے کہ انہی کے طفیل آپ آج اس مسند پر متمکن ہیں۔ سرحدوں پر موجود مجاہدوں کے بارے میں اللہ کا خوف ملحوظ رکھیے کہ وہ اہلِ اسلام کے محافظ و نگہبان ہیں۔ مسلمانوں کے امور و معاملات کا جائزہ لیا کیجیے کہ آپ تنہا ہی ان کے مسئول و ذمہ دار ہیں۔ اپنے دروازے پر آنے والے سائلین کے باب میں بھی اللہ سے ڈریے کہ ان سے غفلت نہ برتیے اور نہ ہی اپنے دروازے ان پر بند کیجیے''۔

عبدالملک نے یہ سب سن کر کہا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔ اس کے بعد حضرت عطاء جانے کے ارادے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ عبدالملک نے آگے بڑھ کر آپ کو روکا اور کہا: ''ابومحمد! آپ نے دوسروں کی حاجات ہم سے بیان کیں، جنہیں پورا کرنے کا ہم نے وعدہ کر لیا، اپنی کوئی حاجت بھی تو بتائیے''۔ فرمایا: ''مجھے مخلوق سے کوئی ضرورت و حاجت درپیش نہیں''۔ یہ کہا اور چل دیے۔ عبدالملک کہنے لگا: ''بخدا یہی حقیقی شرف و منزلت ہے اور یہی اصل سیادت''۔(۳۸)

عبدالملک کے یہ ریمارکس جس شخص کے بارے میں ہیں، کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کی

ظاہری ہیئت وصورت کیسی تھی؟ تو سنیے! جناب عطاء ﷺ کا رنگ سیاہ تھا' آپ بدشکل اور بھاری تن وتوش کے مالک تھے' آنکھوں میں بھینگا پن اور ناک چپٹی تھی' ایک ہاتھ شل تھا اور ٹانگ میں بھی نقص تھا' جس کی وجہ سے لنگڑا کر چلتے تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ نابینا بھی تھے۔ لیکن ان تمام ظاہری عیوب ونقائص کے باوصف آپؒ کو سرداری اور مقامِ بلند حاصل تھا' کیونکہ علم وتقویٰ' زہد وورع اور خلقِ خدا سے استغنا و بے نیازی جیسے اوصافِ حمیدہ سے اتصاف پذیر تھے۔ انہی صفاتِ جمیلہ نے عبدالملک ایسے بادشاہ کو بھی آپ کی مدح وثنا پر مجبور کر دیا' باوجودیکہ وہ عربوں کی روایتی عصبیت بھی رکھتا تھا۔

اس کے برعکس' ذرا ایک نگاہ زمانۂ موجود کے اصحابِ جُبہ ودستار پر ڈالیے کہ جن کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور گیٹ اپ متاثر کن ہوتا ہے' ان کے لباس کی تراش خراش دوسروں کو مرعوب کرتی ہے اور عماموں' پگڑیوں اور عباؤں سے جلال ٹپکتا ہے۔ یہ داڑھیوں کے خط انتہائی اہتمام سے بنواتے اور مونچھیں انتہائی سلیقے سے ترشواتے ہیں۔ ان کے چہروں سے آسودگی کا تاثر چھلکتا اور ان کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ ظاہر کی صورت حال تو یہ ہے' لیکن باطن اتنا ہی غلیظ ونجس اور تاریک تر' جو اگر آشکار ہو جائے تو اس کی سنڈاس سے دماغ پھٹ جائیں! خدا ہدایت نصیب فرمائے۔

⊙ ابن ابی ذئبؒ کی مہدی اور منصور کو نصیحت

آپ کا اسم گرامی محمد بن عبدالرحمٰن بن المغیرہ بن الحارث بن ابی ذئب ہے۔ آپ علم کے بحرِ بیکراں تھے۔ ابن المبارکؒ اور یحییٰ بن سعید القطانؒ ایسے اساطینِ علم وفن کو آپ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ آپؒ انتہائی ثقہ' فاضل' پُروقار اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ حق گوئی اور بے باکی آپ کا شعار تھا۔ آپ کی جرأت مندی اور بے خوفی کی بنا پر امام احمد بن حنبلؒ آپ کو امام مالکؒ پر مقدم قرار دیتے تھے۔ (۳۹)

◆ عباسی فرماں روا مہدی مسجد نبویؐ میں داخل ہوا تو تمام لوگ کھڑے ہو گئے' لیکن ابن ابی ذئبؒ بیٹھے رہے۔ مہتب بن زہیر نے ان سے کہا: کھڑے ہو جاؤ' دیکھتے نہیں کہ امیر المؤمنین آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اِنَّمَا یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ ''لوگ محض پروردگارِ عالم ہی کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں''۔ مہدی' مہتب سے کہنے لگا: ''اسے چھوڑ دو' اس کی بات سے میرے سر کا ایک ایک بال کھڑا ہو گیا ہے''۔

◆ ابوجعفر منصور کے زمانے میں ایک دفعہ ابن ابی ذئبؒ اس کے پاس گئے اور فرمایا: ''لوگ ہلاک ہو رہے ہیں' مالِ فے میں سے ان کی مدد و اعانت کیجیے''۔ منصور غضب ناک ہو گیا اور کہا: ''تو ہلاک ہو جائے' اگر میں سرحدوں کی حفاظت نہ کرتا تو تجھے تیرے گھر میں ذبح کر دیا جاتا''۔ آپ یہ سن کر قطعاً مرعوب نہ ہوئے اور جرأت مندانہ جواب دیا: ''فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تجھ سے بہتر تھے' انہوں نے سرحدوں کی نگہبانی کا فریضہ بھی سرانجام دیا اور وہ لوگوں کو مال و عطیات بھی عطا کرتے تھے''۔ اس پر منصور نے سر جھکا لیا اور اس وقت تلوار مہیب کے ہاتھ میں تھی۔ بعد ازاں کہنے لگا: ''یہ اہلِ حجاز میں سے بہترین شخص ہے''۔

◆ ابونعیم راوی ہیں کہ میں نے جس برس حج کیا ابوجعفر منصور بھی اسی سال حج کے لیے مکہ میں تھا۔ ابن ابی ذئبؒ اور مالک بن انسؒ بھی اس کے ہمراہ تھے۔ منصور نے ابن ابی ذئب کو بلایا اور دار الندوہ میں اپنے ساتھ بٹھا کر پوچھا: ''امیر مدینہ حسن بن زید بن حسن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟'' آپؒ نے جواب دیا: ''وہ عدل و انصاف کرنے کی کوشش کرتا ہے''۔ منصور نے دریافت کیا: ''میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' دو مرتبہ یہی سوال دہرایا۔ ابن ابی ذئبؒ نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا: ''ربّ کعبہ کی قسم! تو ظالم و مستبد ہے''۔ اتنا کہنا تھا کہ ربیع حاجب نے آگے بڑھ کر آپؒ کی ریش مبارک پکڑ لی' لیکن ابوجعفر نے اسے گالی دی اور کہا: کفّ یا ابن اللخناء ''غلیظ عورت کے بیٹے رُک جا!'' پھر حکم دیا کہ ابن ابی ذئب کو تین صد دینار عطا کیے جائیں۔ (۴۰)

(جاری ہے)

زیرِ نظر شمارے میں ''اسلام کا نظامِ حیات'' کے موضوع پر

محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کے مبسوط و مدلّل اور فکر انگیز سلسلۂ خطابات کا آغاز کیا گیا ہے۔

''اسلامی نظام کی فکری اساس: **ایمان**''

کے بعد اگلے خطاب کا عنوان ہے:

اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام

جو اِن شاء اللہ العزیز' آئندہ شمارے میں شائع کیا جائے گا!

کھانسی، نزلہ، زکام
کسی موسم یا کسی وقت کے پابند نہیں

ہمدرد کی مجرّب دوائیں ان کا علاج بھی ہیں اور ان سے محفوظ رہنے کی مؤثر تدبیر بھی

سُعالین

مُفید جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ سُعالین، گلے کی خراش اور کھانسی کا آسان اور مؤثر علاج۔ آپ گھر میں ہوں یا گھر سے باہر، سرد و خشک موسم یا گرد و غبار کے سبب گلے میں خراش محسوس ہو تو فوراً سُعالین لیجیے۔ سُعالین کا باقاعدہ استعمال گلے کی خراش اور کھانسی سے محفوظ رکھتا ہے۔

جوشینا

نزلہ، زکام، فلو اور اُن کی وجہ سے ہونے والے بخار کا آزمودہ علاج۔

جوشینا کا روزانہ استعمال موسم کی تبدیلی اور فضائی آلودگی کے مضر اثرات بھی دُور کرتا ہے۔

جوشینا بند ناک کو فوراً کھول دیتی ہے۔

لعوق سپستاں

نزلے زکام میں سینے پر بلغم جم جانے سے شدید کھانسی کی تکلیف طبیعت نڈھال کر دیتی ہے۔

اس صورت میں صدیوں سے آزمودہ ہمدرد کا لعوق سپستاں، خشک بلغم کے اخراج اور شدید کھانسی سے نجات کا مؤثر ذریعہ ہے۔

ہر موسم میں، ہر عمر کے لیے

صُدوری

مؤثر جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ خوش ذائقہ شربت۔ خشک اور بلغمی کھانسی کا بہترین علاج۔ صدوری سانس کی نالیوں سے بلغم خارج کر کے سینے کی جکڑن سے نجات دلاتی ہے اور پھیپھڑوں کی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے۔ بچوں، بڑوں سب کے لیے یکساں مُفید۔

شوگر فری صُدوری بھی دستیاب ہے۔

سُعالین، جوشینا، لعوق سپستاں، صُدوری — ہر گھر کے لیے بے حد ضروری

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔

ہمدرد کے متعلق مزید معلومات کے لیے ویب سائٹ ملاحظہ کیجیے۔
www.hamdard.com.pk

Adarts-SJLS-1/2001

March 2010
Regd CPL No. 115
Vol.59
No.3

Monthly **Meesaq** Lahore

- ہمارا دین "دینِ توحید" ہے اور "توحید" کی ضد "شرک" ہے۔
- شرک سب سے بڑا گناہ ہے اور ناقابلِ درگزر ہے۔
- قرآن کی رو سے شرک "ظلمِ عظیم" ہے۔
- شرک ہر دور میں نئی نئی صورتیں اختیار کرتا ہے۔
- مسلمان جہالت اور ناسمجھی کے سبب شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

شرک کی حقیقت اور اس کی اقسام سے واقفیت' اور دورِ حاضر کے شرک سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے مطالعہ کیجیے:

حقیقت و اَقسامِ شرک

بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** حفظہ اللہ

کے چند فکر انگیز خطابات

معیاری کمپیوٹر کمپوزنگ ❁ عمدہ طباعت ❁ 128 صفحات

قیمت: اشاعت عام: 50 روپے' اشاعت خاص: 90 روپے

شائع کردہ: **مکتبہ خدام القرآن لاہور**

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 3-35869501

email: maktaba@tanzeem.org Website: www.tanzeem.org